ہدایت نامہ سلوکِ قلندری

(فضلِ ربی)

جلد دوئم

سید غلام حیدر شاہ قلندری

انجمن غلامانِ قلندر ویلفیئر سندھ، پاکستان

کتاب: 33

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نامِ کتاب:	ہدایت نامہ سلوکِ قلندری (فضلِ ربی)
مصنف:	سید غلام حیدر شاہ قلندری
معاون کار:	الطاف ملکانی
مرتب کنندہ:	شیر خان پنہور
اشاعت اول:	اکتوبر 2025ع
شائع کنندہ:	انجمن غلامانِ قلندر (ویلفیئر) سندھ۔ پاکستان ۔انفارمیشن شعبہ
تعداد:	1000
قیمت:	400

HIDAYAT NAMA SULOOK-E-QALANDARI
(VOLUME: 02)
1st EDITION: © OCTOBER 2025
PUBLISHED BY: A.G.Q.W SINDH PAKISTAN
INFORMATION DEPARTMENT.
COMPOSING: SHER KHAN PANHWAR
Contact: 0300-3483688, 0313-3738040
Email: sherkhan.itian@gmail.com

انتساب۔

میں یہ کتاب اپنے اُن وفادار دوستوں کے نام کرتا ہوں،
جن کے نام میرے دل پہ لکھے ہوئے ہیں۔
جنہوں نے ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا۔

سید غلام حیدر شاہ قلندری۔

فہرست

1. نورِ ہدایت (الطاف ملکانی)........08
2. راستہ نجات (مصنف)........09
3. بابِ وحدانیت........10
- شرک........10
- دنیا........13
- طریقت، معرفت روحانیت........14
- نماز........15
- راہِ نجات........17
- نورِ ہدایت........19
- حق کا راستہ........20
- طاقت کا سرچشمہ........21
- التجاو مناجات........22

4. بابِ کثرت درود پاک........23
- درود پاک کی نعمت........23
- پریشانی کا حل........24
- درود پاک پڑھنا اور پڑھانا........25
- وفاءِ درود پاک........26
- فنا سے بقا کا راستہ........27
- شوقِ درود پاک........28
- درود پاک کی روشنی........29
- دل کی صفائی........30
- تقویٰ اور درود پاک........31
- نورِ محمدی ﷺ۔ درود کی برکتوں کا راستہ........31
- باطنی سفر........32

5. بابِ عشق 33
- عشق، فریب اور نجات کا راستہ 33
- بقاءِ عشق 35
- مقامِ عشق 36
- عشق کا راستہ 38
- تفسیرِ عشق 39
- رازِ عشق 41
- عشق رسول ﷺ 42
- رحمتِ ﷺ 43
- وفاءِ محبت 44
- سلیقہءِ محبت 45
- نمازِ عشق 46
- ایک محب سے ایک محبوب کا سفر 47
- انسانیت کا عشق 49
- صاحبِ ارشاد 50
- عشق، صبر اور رضا کا استعارہ 51
- حقیقتِ عشق 53
- صبر، راز اور بصیرت کا سفر 55
- مقامِ علی علیہ اسلام 58
- مسلکِ عشق 60

6. بابِ اخلاقیات اور عبادات 61
- فقیری کا راستہ 61
- دوستی 63
- آخرت 65
- فکرِ زمانہ 66
- نصیحت 68

- منافق 69
- سوداگری 70
- دنیاوی خواہشات 71
- فضل و کرم 72
- صحبتِ فقیر 73
- معاشرتی ٹھنڈک 74
- حقیقتِ زندگی 76
- فکرِ طلب 78
- صوفیت 78
- اقتدارِ نفس 79
- دنیاوی چمک 80
- صحبت 81
- آخرت کا فکر 82
- شیخ کا تصور 83
- راہِ نجات 84
- نعمتِ خداوندی 85
- تلاشِ حق 87
- ادب 88
- مٹی کی خوشبو 89
- نسبت و رغبت 91
- صبر و استقامت 92
- روحانی راز 94
- زندگی کا سفر 95
- حکمت و بھلائی 97
- کاریگر کی ضرورت 99
- روشن چراغ 100

- راہِ فقر ... 101
- علم کی حکمت ... 101
- منافقت اور بد بختی ... 102
- فنا و بقا ... 104
- نقالی سے بچو ... 105
- علم اور جہل کا فرق ... 107
- سچائی کی پہچان ... 109
- سچ اور جھوٹ کی پہچان ... 111
- فنا اور بقا کا شعور ... 113
- عبادت اور دکھاوا ... 115
- سچ اور جھوٹ ... 117
- خوش نصیبی ... 119
- ایمان کا شوق ... 121
- اطمینان اور جلد بازی ... 123
- مصلحت و دور اندیشی ... 125
- رہبر، استاد، مرشد ... 127
- کتابن جی فہرست ... 128

نورِ ہدایت

یہ دنیا ایک بھول بھلیوں کا جال ہے اور انسان علم، عقل رکھنے کے باوجود بھی اس مایا جال سے نکل نہیں سکتا۔ مادی خواہشیں، دنیاوی ضروریات صبح سے شام تک انسان کو ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح دوڑاتی رہتی ہیں۔ انسان ہزار مادی سہولیات حاصل کرکے بھی پر سکون، مطمئن نہیں ہے۔ دولت، شہرت، عزت، اقتدار اور طاقت کی حوس ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور یہ سب اس لیئے ہے کہ انسان اپنے مالک حقیقی اور خالقِ کائنات سے رابطے توڑ بیٹھا ہے۔ انسان تو اس مادی جہان کے چمک دمک میں اپنے خالق کو بھول جاتا ہے لیکن وہ رب رحمان و رحیم ہے وہ اپنے نائب اور اشرف المخلوقات کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ خدا نے تمام انسانوں کی ہدایت کے لیئے اپنے سوا لاکھ پیغمبر بھیجے بلکہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے بعد بھی اپنے پسندیدہ بندے اور صاحبِ ولایت شخصیات کی معرفت ہدایت کے چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں جو بھولے بھٹکے انسانوں کو اس کی اصل راہ کی طرف بلاتے ہیں اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج کے دور میں انجمن غلامانِ قلندر ویلفیئر سندھ پاکستان کے رہبر و رہنما سائیں سید غلام حیدر شاہ قلندری کا وجود مسعود ہی وہ روشن چراغ ہے جو دنیاوی اندھیرو میں پھنسے ہوئے ذہنوں کو عشقِ محمدی ﷺ اور کثرتِ درود پاک سے نورِ ہدایت کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور یہ کتاب "ہدایت نامہ سلوکِ قلندری" ان کی طرف سے بھولے بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیئے ایک روحانی نصاب اور گائیڈ بک ہے۔ جو ایک عام پڑھے لکھے بندے سے لیکر یونیورسٹی کے طالب علم اور ایک اسکالر سے لیکر ایک عالم اور صوفی تک کے لیئے عشق کا درس ہے۔ بس اس درس کو دل سے پڑھنے اور خلوصِ نیت سے اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

الطاف ملکانی۔

راستہ نجات

کتاب "ہدایت نامہ سلوکِ قلندری" درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے۔ موجودہ حالات میں، جہاں مذہب کے نام پر مختلف تنظیمیں، عقائد، اور نعرہ بازی کے ہجوم موجود ہیں، وہیں فرقوں کے باہمی تنازعات اور سوشل میڈیا پر مناظروں نے عوام الناس کو مذہب کی اصل روح سے دور کر دیا ہے۔

اخلاص سے خالی اس فضا نے خصوصاً نوجوان نسل کو دین سے کنارہ کش کر کے دیگر نظریات کی طرف مائل کر دیا ہے۔ روز بروز کے ان فتنوں نے امت اور ملت، دونوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہر شخص خود کو حق پر ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو کافر قرار دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔

ایسے ہی دور میں یہ کتاب، سنجیدگی کے ساتھ صوفیانہ طرزِ زندگی گزارنے کا راز عیاں کرتی ہے، جو سیرت النبی ﷺ کی تعلیمات اور قرآنِ مجید کی روشنی میں ترتیب دی گئی ہے۔

ان شاءاللہ، یہ کتاب راہِ ہدایت کے متلاشیوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔

سید غلام حیدر شاہ قلندری۔

بابِ وحدانیت

شرک

دوستو! شرک کا مفہوم ہے "شراکت داری"۔ مگر کس سے شراکت داری؟ اگر شراکت داری کسی انسان سے ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر یہ شراکت داری اپنے مالک، یعنی تمام جہانوں کے خالق و مالک سے ہو، تو یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ وہ مالک، جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری سانسیں تک ہیں، اس دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ وہ مالک الملک بھی ہے اور القدوس بھی۔ یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ اگر یہ صفات کسی مخلوق سے منسوب کی جائیں تو یہ شرک فی الصفات کہلائے گا، کیونکہ مخلوق اور خالق کی صفات یکساں نہیں ہو سکتیں۔ جس کسی نے بھی خالق کی صفات مخلوق میں ڈھونڈنے کی کوشش کی، اس نے شرک فی الصفات کیا۔

البتہ، ایک دنیاوی باپ اپنی اولاد کی کفالت، تربیت اور تعلیم کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسی طرح ایک استاد اپنے شاگردوں کو علم دینے میں مجاز ہوتا ہے۔ اسی طرح، ایک روحانی پیشوا روحانیت سکھانے میں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، ظاہری طور پر "مالک" کہلا سکتا ہے، لیکن یہ شرک فی الصفات نہیں، بلکہ اللہ کے دیے ہوئے فضل کا اظہار ہے۔ کوئی بھی مخلوق، خواہ وہ انبیا علیہم السلام ہوں یا ملائکہ، اگر وہ خالق کی حیثیت کا دعویٰ

کرے یا اس درجے کو چھونے کی کوشش کرے، تو وہ شرک فی الصفات میں داخل ہو جاتا ہے۔ عبادت جیسے سجدہ، رکوع، اور جھک کر اللہ رب العالمین کے حضور پیش ہونا یہ صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔ ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اللہ کا حکم تھا، اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی، جو کہ دراصل خالق کا حق اور مخلوق پر واجب اطاعت تھا۔ جب عزازیل (ابلیس) نے اس حکم کی نافرمانی کی، تو وہ مردود اور ملعون بن گیا۔ درحقیقت، ابلیس کا سجدہ نہ کرنا مشیتِ الٰہی تھی، جیسے حضرت آدمؑ کا گندم کھانا بھی اللہ کا راز اور حکمت تھی۔ نہ کھانے کا حکم بھی اسی رب نے دیا، اور دنیا میں بھیجنا بھی اسی کی تقدیر کا حصہ تھا۔

یاد رکھیں: سجدہ کعبہ کو نہیں ہوتا، بلکہ رخ اس طرف کرنے کا حکم ہے۔ سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ اگر کسی نے بت، انسان یا کسی اور کو سجدہ گاہ اور مستحقِ عبادت سمجھا، تو یہ شرک فی العبادات کہلائے گا۔ کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرح مان لینا، جیسے مجوسی، بت پرست یا آتش پرست کرتے ہیں، یہ اسلام کے عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الأنفال: 17)

ترجمہ: "(اے محمد ﷺ!) جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو (درحقیقت) تم نے نہیں پھینکیں، بلکہ اللہ نے پھینکیں۔"

یعنی، ظاہری عمل تو نبی کریم ﷺ کا تھا، لیکن درحقیقت وہ اللہ کی رضا، امر، اور فضل کا مظہر تھا۔

اسی طرح، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" (التوبہ: 128)

ترجمہ: "مؤمنوں پر نہایت شفقت فرمانے والے اور مہربان ہیں۔"

یہ صفات نبی کریم ﷺ کے لیے اللہ کی عطا کردہ عنایتیں ہیں، جیسے کہ قاب قوسین، مقام محمود، اور انبیاء کرامؑ کو ملنے والے معجزات۔ یہ سب اللہ کے انعامات ہیں، اور ان سے مخلوق، خالق نہیں بن جاتی۔ اسی طرح اولیاء اللہ کو ملنے والی کرامات، رب کی طرف سے تحفہ و عنایت ہوتی ہیں۔

درود شریف پڑھنے والے کا درود بارگاہِ نبوی میں پیش کیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو درود سننے اور پہچاننے کا اختیار بھی عطا فرمایا۔ لہٰذا، اگر کوئی امتی محبت سے نبی کریم ﷺ کو پکارتا ہے، تو یہ رب کے فضل کی بدولت ہے نہ کہ شرک۔ علمِ غیب صرف اللہ کو حاصل ہے،

جیسا کہ فرمایا:

"قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ" (النمل: 65)

ترجمہ: "کہہ دو: جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، وہ غیب کو نہیں جانتے، سوائے اللہ کے۔"

یہ سب عطائیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص دوسروں کو شرک کے طعنے دے، وہ خود اس کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔"

تفسیر ابنِ کثیر، جلد 2، صفحہ 271، سورۃ الأعراف آیت 175** کے تحت محدث ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"آقا ﷺ نے فرمایا: مجھے تمہارے مشرک ہو جانے کا ڈر نہیں، بلکہ آپس میں لڑنے جھگڑنے (خونریزی) کا خوف ہے۔" (بخاری شریف)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو شرک سے محفوظ رکھے، اور حق بات کو سمجھنے اور اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو، اور ہمیں اپنی رضا کی راہ پر ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

دنیا

اے دوست! یہ دنیاوی چمک دمک ایک ہرنی کی چال جیسی ہے، جو دل کو بہکا کر دوڑائے رکھتی ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ یہ بھی ہو، وہ بھی ہو، سب کچھ مل جائے، اور یہ سب لازماً ہونا چاہیے۔ لیکن یہی چاہتیں، یہی حرص و لالچ انسان کو آخرت کی فکر اور موت کی یاد سے غافل کر دیتی ہیں۔ پھر وہی کیفیت آتی ہے جسے قرآن نے بیان فرمایا:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢﴾

"زیادہ کی چاہت نے تمہیں غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔"

لیکن، اللہ والے اور اولیاء کرام، جو دراصل انسانیت کے اصل خیر خواہ ہیں، وہ سمجھاتے ہیں کہ یہ سب چکر فضول ہیں۔ یہ دنیاوی خواہشات ایک شطرنج کے کھیل کی طرح ہیں۔ جتنا زیادہ کھیلتے جاؤگے، اتنا ہی اس کے جال میں پھنستے چلے جاؤگے۔

وہ ہمیں "إِنَّ اللهَ مَعَ الصَّابِرِينَ" کا پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل کامیابی اس میں ہے کہ تم اس ذات سے ناطہ جوڑ لو جس کے قبضے میں یہ پوری کائنات ہے۔ جب وہ مل جائے گا، جب اس کی یاد دل میں اتر جائے گی، تو دنیا کی بے فائدہ خواہشیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ پھر نہ دل میں تڑپنے والی حرص رہے گی، نہ ہی ختم نہ ہونے والے غم۔

ایسا شخص پھر دونوں جہانوں کی خوشیوں کا وارث بن جاتا ہے:
دنیا میں دل کا سکون، اور آخرت کی دائمی نعمتیں مل جاتی ہیں۔

طریقت، معرفت روحانیت

دوستو! روح اگر زندہ ہوگی تو روحانیت نظر آئے گی۔ میری مراد یہ ہے کہ روح صرف زندہ انسان میں ہوتی ہے، مردہ میں نہیں۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں: "جس کا قلب جاگ جائے، وہی حقیقت میں زندہ ہے روحانی طور پر۔"

جن لوگوں کا قلب سویا ہوا ہوتا ہے، وہ بظاہر دنیا میں چلتے پھرتے تو نظر آتے ہیں، مگر ان کی روحانی حیثیت ایک مردہ انسان جیسی ہوتی ہے۔

ایسے لوگوں میں حسد، بغض، نفرت اور انا کی کثرت ہوتی ہے، اسی لیے وہ نیکی کی طرف نہیں، بلکہ شیطانی حرکتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود حق کو دیکھ نہیں پاتے۔

ایسا ہی واقعہ کربلا میں پیش آیا بہت سے لوگ حق کو دیکھ نہ سکے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے زمانے میں، جیسے ابو جہل جسے آنکھیں تو دی گئی تھیں، مگر اس کا دل اندھا تھا۔ وہ بیچارہ بھی ناکام رہا، کیونکہ وہ باطنی حقیقت سے غافل تھا۔

یہ سب اُس کے استاد ابلیس کی پیروی کا نتیجہ تھا، جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا کیونکہ وہ آدمؑ کو "انسان" ماننے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اُس روحانی راز کو سمجھ نہ سکا جو اللہ نے آدمؑ میں رکھا تھا۔

آج بھی یہی حال ہے بہت سے لوگ ان باتوں کو سمجھ نہیں پاتے، کیونکہ وہ دیکھ نہیں سکتے۔ ان کی آنکھوں پر حسد، کینہ اور بغض کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں! یاد رکھیں:

حق میں حکمت ہے، اور جھوٹ کے پیچھے شیطانی شرارت۔

نماز

دوستو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اُن کے سامنے سجدہ کریں۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔ یاد رکھیے! "قالوا بلیٰ" کے وقت، یعنی عالمِ ارواح میں، کچھ قول و اقرار ہماری روحوں سے لیے گئے تھے۔ انہی میں ایک اقرار یہ بھی تھا کہ مٹی کے بنے ہوئے جسم میں داخل ہو کر واپس نکلنا ہوگا۔ اس کے بعد روح کو جسم میں داخل کیا گیا، اور حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کے اجسام وجود میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں قیام کی اجازت دی، مگر ابلیس کی نافرمانی پر اسے شیطان کہا گیا۔ اس نے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی۔ شیطان کی انسان کے خلاف پہلی چال یہ تھی کہ اُس نے حضرت آدم اور اماں حوا سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروائی۔ جس کے نتیجے میں دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا۔ یوں شیطانیت اور انسانیت آمنے سامنے آگئیں۔ اب انسان کبھی شیطان کے ساتھ ہو کر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اور کبھی اللہ کے ساتھ ہو کر شیطان کی مخالفت کرتا ہے۔

دوستو! اتنی تفصیل سے یہ سب باتیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے سامنے نہ جھکنے کا رویہ، سب سے پہلی "سزا" اور "جزا" کی بنیاد بنا۔ اور ہم پر اللہ کا فضل ہے کہ ہمیں مسلمان بنایا گیا، تاکہ ہم اس مالکِ کائنات کو سجدہ کریں، اور اُس کے احکام کی پیروی کریں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (سورۃ البقرہ، آیت 43)

ترجمہ: "اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (سورۃ البقرہ، آیت 45)

ترجمہ: "صبر اور نماز سے مدد لو۔ یقیناً یہ نماز بھاری ہے، مگر اُن پر نہیں جو خشوع والے ہیں۔"

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (سورۃ البقرہ، آیت 110)

ترجمہ: "نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔"

دوستو! اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے ہمارے نبی، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے موقع پر پانچ نمازوں کا تحفہ عطا کیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ

(نماز مؤمن کی معراج ہے)

نماز ایک مکمل روحانی، جسمانی اور ذہنی ورزش ہے، جس میں بے شمار ایمانی فوائد پوشیدہ ہیں۔ یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اور بندے کے لیے ایک ایسی یاد دہانی ہے جو اُسے: آخرت، قبر، حشر کا حساب اور رب کی وحدانیت یاد دلاتی ہے۔ یہی نماز دنیا کی مصروفیات میں گم انسان کو پلک جھپکتے میں آخرت کی حقیقت سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ انسان کو مادیت پرستی سے نکال کر رب کی بندگی میں لے آتی ہے۔ یہی نماز انسان کو عارضی آقاؤں کے سامنے جھکنے سے نکال کر صرف اللہ کے سامنے جھکنا سکھاتی ہے۔ جب بندہ سجدے میں جاتا ہے تو دل سے کہتا ہے: "اے میرے رب! اصل بادشاہی تو تیری ہی ہے۔ رزق دینے والا بھی تو ہے۔ میں اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے تجھے بھول گیا تھا...

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ تو ہی سیدھا راستہ دکھا!"

پھر بندہ کہتا ہے: إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔"

اور جب بندہ التحیات پڑھتا ہے، تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج کر گواہی دیتا ہے کہ: "میں ان کی پیروی کرتا ہوں جنہوں نے اپنے رب کے ہر حکم کو مانا!"

دوستو! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا نمازی بنا دے جو صرف جسم سے نہیں، دل و جان سے نماز قائم کرے۔ آمین یا رب العالمین۔

راہِ نجات

انسان، شیطان، اور بندگی کا اصل مفہوم اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرما کر، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے سامنے سجدہ کریں۔

تمام فرشتے اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے، مگر ابلیس نے انکار کیا۔اسی انکار نے اسے نافرمان، مردود، اور شیطان بنا دیا۔ یاد رکھو! ہم سب کی روحوں سے "قالوا بلیٰ" کے وقت ایک اقرار لیا گیا تھا کہ ہم صرف اللہ ہی کے بندے ہیں اور اسی کے حکم کو مانیں گے۔

پھر روح کو مٹی کے جسم میں داخل کر کے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہا السلام کو پیدا کیا گیا،اور جنت میں رکھا گیا۔

شیطان نے انسان کو گمراہ کرنے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی،اور اس کی سب سے پہلی چال یہی تھی کہ آدم و حوا کو اللہ کے حکم کی خلاف ورزی پر آمادہ کرے جو انجاماً، جنت سے نزول پر منتج ہوئی۔ یہیں سے انسان اور شیطان آمنے سامنے آ گئے۔انسان کی پوری زندگی ایک مسلسل جنگ ہے جہاں کبھی وہ نافرمانی میں شیطان سے جا ملتا ہے،اور کبھی فرمانبرداری میں اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔

دوستو! یہ سب کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نہ جھکنے کی سزا سب سے پہلے ابلیس نے پائی،اور جو جھکا، وہ کامیاب ہوا۔ الحمدللہ! ہم امتِ محمد ﷺ ہیں، ہمارے لیے سجدہ کرنا نہ صرف عبادت ہے بلکہ نجات کا راستہ ہے۔ہم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہمیں ایک ایسا نبی ﷺ عطا فرمایا جن کے ذریعے ہمیں اللہ کا کلام (قرآن) ملا،اور اس کلام میں نماز کا حکم بار بار آیا ہے۔ معراج کی رات، جب میرے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ، اللہ کی بارگاہ میں پہنچے، تو اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ ﷺ کو پانچ نمازوں کا تحفہ عطا فرمایا۔

نماز روح کی پاکیزگی، جسم کی طہارت، عقل کی روشنی اور دل کی سلامتی کا ذریعہ ہے۔ یہی نماز میرے نبی ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے،اور ہر مؤمن کی یاد دہانی بھی کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ جب بندہ دنیا کی مصروفیات سے تھک کر نماز کی طرف پلٹتا ہے، تو اسے قبر، حشر، حساب، کتاب اور اللہ کی وحدانیت فوراً یاد آ جاتی ہے۔

نماز بندے کو دنیا کی خواہشات سے الگ کر کے بس رب کی ثنا اور حمد میں لگا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ جو شخص دنیاوی آقاؤں کے سامنے جھکتا رہا ہو، نماز میں وہ رب کے سامنے سچائی سے اقرار کرتا ہے: "اے میرے مالک! اصل میں تو ہی میرا رب ہے، تو ہی روزی دینے والا ہے، میں دنیا کے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے تجھے بھول گیا تھا۔"

پھر جب وہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" پڑھتا ہے، تو گویا دل سے کہہ رہا ہوتا ہے: "یا اللہ! مجھے وہی راستہ دکھا جو تیرے محبوب ﷺ کا ہے۔"

"إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ"

کا مطلب صرف الفاظ نہیں، بلکہ ایک زندہ عہد ہے۔ نماز میں جب ہم التحیات پڑھتے ہیں، تو اپنے نبی ﷺ پر درود بھیج کر گویا ایمان کی تجدید کرتے ہیں، کہ: "میں ایمان لایا اس نبی پر اور ان کے نقشِ قدم پر چلوں گا جنہوں نے رب کی بات مانی۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا نمازی بنائے جو نماز صرف وقت پورا کرنے کے لیے نہ پڑھے، بلکہ دل کی حضوری اور روح کی طلب کے ساتھ اپنے رب کے سامنے جھکے۔

ہم وہ نمازی بنیں جن کی نماز ہمیں شیطان کے فریب، دنیا کی فتنہ پرستی، اور خواہشات کے جال سے نکال کر رب کے قریب کر دے۔ آمین.

نورِ ہدایت

دوستو! محبوبِ خداﷺ رحمت ہیں، اور یہی رحمت دراصل درودِ پاک کی کثرت میں پوشیدہ ہے۔ درود پاک وہ نور ہے جو اندھیروں میں روشنی بن کر چمکتا ہے۔

جب یہ نور طلوعِ اسلام کی طرف اشارہ کرتا ہے تو توحید کا راستہ خود بخود اختیار ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی بندہ اس نور کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے تو وہ خود نورِ قلب بن جاتا ہے۔

پھر اس کے دل کا یہ نور چمکنے لگتا ہے اور وہ روشنی، روشنی بانٹنے لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کی سورۃ النور، آیت 40 میں فرماتے ہیں:

أَوْ كَظُلُمَٰتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: "(کافروں کے اعمال) اس گہرے سمندر کی تاریکیوں کی مانند ہیں، جسے ایک موج نے ڈھانپا ہو، پھر اس کے اوپر ایک اور موج ہو، اور اُس کے اوپر بادل ہوں یہ تاریکیاں ایک کے اوپر ایک ہیں۔ جب (ایسا شخص) اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے دیکھ نہیں پاتا، اور جس کے لیے اللہ نے نور (ہدایت) نہ بنایا، تو اُس کے لیے کہیں بھی کوئی نور نہیں۔"

پس، اے دوستو! اس نورِ درود کو کبھی نہ چھوڑو۔ یہی درود وہ روشنی ہے جو دلوں کے اندھیرے مٹا دیتی ہے، راستے کھول دیتی ہے، اور ان شاء اللہ تمہاری زندگی بھی روشن کر دے گی اور آخرت بھی منور کر دے گی۔

حق کا راستہ

قرآنِ مجید میں سورۃ الفاتحہ کے اندر "صراطِ مستقیم" یعنی سیدھے راستے کی بات کی گئی ہے۔ اسی راستے پر چلنے والوں کے لیے فرمایا گیا ہے:

"صراطَ الّذینَ أنعمتَ علیهم"

یعنی "ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام فرمایا۔"

تو یہ انعام یافتہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"

یعنی "نہ ان پر کوئی خوف ہے، اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"

یہ وہ لوگ ہیں جو پاکیزہ زندگی گزارتے ہیں، تقویٰ کے حامل ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ:

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

یعنی وہ کسی کو ایذا نہیں دیتے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی فلاح کی طرف بلانے والے۔ وہ امت کو تقسیم کرنے والے نہیں، بلکہ جوڑنے کا جذبہ پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ایسے افراد خود ادارے بن جاتے ہیں جو خیر، اخوت اور وحدت کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی زندگی مجموعی طور پر اخلاقیات کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہ دینِ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے فضول ایک قطرہ پانی بھی ضائع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے میں وہ کبھی بھی بے فائدہ اور غیر شرعی رسم و رواج کو نہ اپناتے ہیں، نہ رواج دیتے ہیں۔ وہ ذاکرین (اللہ کو یاد کرنے والے) اور محسنین (نیکی کرنے والے) ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کے نام سے منسوب کر کے کوئی غلط رسم یا روایت جاری کر رکھی ہو، تو یقین جانیں وہ ان کے پیروکار نہیں، بلکہ خود ساختہ مفاد پرست لوگ ہوتے ہیں۔ یہ سچے اہلِ اللہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولﷺ کی تعلیمات کی طرف بلانے والے ہوتے ہیں، نہ کہ دنیاوی فائدے، شہرت یا تجارت کی نیت سے کام کرنے والے۔ جبکہ آج، کچھ لوگ ایڈیٹنگ، ایڈورٹائزنگ اور بڑے بڑے لقب دے کر ان پاکیزہ ہستیوں کے ناموں کے پیچھے دنیاوی فوائد سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں نہ ان عظیم ہستیوں کے وارث ہیں، نہ ان کے راستے پر۔

طاقت کا سرچشمہ

ہر طاقت، درحقیقت اُس ہی کے پاس ہے جو "علیٰ کلِّ شیءٍ قدیر" ہے، یعنی جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن اس طاقت والے قوی و قادر رب نے اپنے بندوں کو مختلف نوعیت کی طاقتیں عطا فرمائیں:

کسی کو خوبصورتی، کسی کو دولت، کسی کو اقتدار و حاکمیت، کسی کو علم و عقل اور حکمت، اور کسی کو سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر فنون عطا کیے۔

تاہم ان ظاہری طاقتوں کے علاوہ بھی کچھ ایسے روحانی انعامات ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ اپنے چُنیدہ اور محبوب بندوں کو عطا کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

"صراط الّذینَ أنعمتَ علیهم"

یعنی انعام یافتہ وہ لوگ جن پر اللہ نے خاص انعام فرمایا۔

اگر تمام طاقتوں کو دیکھا جائے، تو روحانی طاقت سب سے وسیع، سب سے پُراثر، اور سب سے طاقتور ترین ہوتی ہے۔

جہاں دنیاوی طاقت کے ساتھ اکثر تکبر، غرور اور نقصان دہ رویے جنم لیتے ہیں، وہیں روحانیت جب فضلِ عظیم کی صورت میں عطا ہو، تو وہ انسان کو عاجزی، انکساری اور صبر کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ ایسا بندہ "بندہ" ہی بن کر رہتا ہے نہ وہ خود کو مالک سمجھتا ہے، نہ دوسروں پر برتری جتاتا ہے، بلکہ اللہ کے بندوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آتا ہے، اور خود اللہ سے ڈرنے والا (متقی) بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس، وہ لوگ جو دنیاوی طاقت پا کر تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ اپنے آپ کو وقتی طور پر "مالک" سمجھ بیٹھتے ہیں، لیکن اسی گھمنڈ میں خود کو ہلاکت کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

التجا و مناجات

اے ربِ کریم، اے ربِ کریم! اے ربِ رحمٰن! ہمیں اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرنا۔ ہمیں کبھی ایسا نہ گرانا کہ تیرے دروازے کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازے ڈھونڈتے پھریں۔

یا رحمٰن! ہم پر اپنی رحمت فرما، اور اپنی رحمت اللعالمین ﷺ کے صدقے ہمیں بھی اپنی رحمت سے نواز دے۔

ہمیں محبّ محسنین کی صحبت عطا فرما، اور ان کے ساتھ وابستگی نصیب کر دے جو تیرا ذکر کرنے والے، تیری مخلوق سے خیر خواہی رکھنے والے ہیں۔

یا رب! ہمیں کبھی لاوارث، تنہا، اور اکیلا نہ چھوڑ۔ ہمیں اپنی محبوب ترین نعمتوں سے محروم نہ کر۔ ہمیں ان انعام یافتہ بندوں کی پیروی عطا فرما، جنہوں نے تجھے پانے کا ہنر سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، اور ہمیں بھی ان ہی میں شامل فرما۔

ہمارے والدین، روحانی اساتذہ، اور اولاد کو معاف فرما، اور ان سب پر اپنی مغفرت و رحمت کے دروازے کھول دے۔

ہم اپنے دینی اور دنیاوی تمام کام تیرے سپرد کرتے ہیں، اور تیرے محبوب خاتم النبیین، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کی آل پر درودِ پاک کی کثرت کرتے ہیں، اور اس عمل کو دوسروں تک بھی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یا اللہ! ہماری یہ چھوٹی سی کاوش قبول فرما، اور ہمیں ہمت، استقامت، اخلاص اور صدق عطا فرما۔

آمین یارب العالمین۔

باب کثرتِ درود پاک

درود پاک کی نعمت

دوستو! درودِ پاک پڑھنا باعثِ فخر اور سعادت سمجھا جاتا ہے۔ جو حضرات درودِ پاک کی کثرت کرتے ہیں، ان کے دلوں میں درود کے ساتھ والہانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے ذوق اور عشق بڑھتا ہے، روح میں وہ خوشگوار رونقیں واپس لوٹ آتی ہیں جو معاشرتی کثافتوں کی وجہ سے ایک مسلمان مومن سے چھن چکی ہوتی ہیں۔

جب درود رحمت بن کر نازل ہونا شروع کرتا ہے تو مخالفین اور منافقین، جو حسد کی وجہ سے آپ کو کامیابی اور بھلائی میں دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے، آپ کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کرنے کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کی ساری شیطانی چالیں اور شرارتیں درودِ پاک کی برکت سے بے اثر ہو جاتی ہیں۔

نفس کی خواہشات کی وجہ سے کیے گئے سابقہ گناہ اور خطائیں بھی، درودِ پاک کی کثرت کے صدقے معاف ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ سے جڑنے لگتا ہے، نیک کاموں کی رغبت اور برے اعمال سے نفرت دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی تو درود کی سب سے بڑی نعمت اور رحمت ہے۔ یہی درودِ پاک ہے جو رکے ہوئے کاموں میں آسانی پیدا کرتا ہے، جائز کاروبار میں برکت بخشتا ہے، زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ ضروریات پوری کرتا ہے۔ ظاہر و باطن کو نورانی بنا دیتا ہے، وسوسوں، خوف، غم، جہنم اور دنیاوی حادثات سے بے خوف و بے فکر کر دیتا ہے۔

دوستو! آئیں اپنی عادتیں بدل کر دیکھیں، درودِ پاک کی کثرت کرکے دیکھیں، آپ بھی عظیم نعمت اور رحمت کے سمندر سے حصہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

پریشانی کا حل

دوستو! پریشانی دراصل اُس خواہش کا اظہار ہے، جس کو پانے یا حاصل کرنے کی جستجو انسان کو تڑپاتی ہے۔ ایک طرف روزمرہ زندگی کے مسائل ہوتے ہیں، جنہیں ہم جلدی میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اکثر وہ ہمارے بس میں نہیں ہوتے۔ کچھ خواہشات ہماری اپنی ہوتی ہیں، اور کچھ ہمارے خاندان کے اُن افراد کی، جو معاشرے میں اپنے پڑوس اور رشتہ داروں کے اسٹیٹس سے متاثر ہو کر جلدی سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ان کی ضد اور تقاضے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ ایک شریف النفس انسان کو بھی بعض اوقات غلط راستوں، حتیٰ کہ حرام کی تلاش کی دوڑ میں شامل ہونا پڑ جاتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں اگر کسی روحانی تربیت یافتہ شخصیت سے واسطہ پڑ جائے تو وہ انسان کو حوصلہ فراہم کرتی ہے، اور آہستہ آہستہ اسے اُس پٹڑی پر لے آتی ہے جہاں اسے معاشرے کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی قوت اور بردباری عطا ہو جاتی ہے۔

بس دوستو! یہی ہمارا عظیم مقصدِ فکر ہے، جسے ہم درودِ پاک کی کثرت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

درود پاک پڑھنا اور پڑھانا

"إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ"

"محب اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے"

دوستو! درود پاک کو کثرت سے پڑھنے والا شخص محبت اور اتباع کے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی روح کو محبوبِ کریم ﷺ کی روح انور کا قرب نصیب ہونے لگتا ہے۔ درودِ پاک ہر حال میں مقبول اور بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں شرفِ قبولیت پانے والا عمل ہے۔ اس کی برکت سے درجات بلند ہوتے ہیں، نیکیوں کا پلڑا بھاری اور گناہوں کا بوجھ ہلکا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

بس درودِ پاک پڑھنے کی دیر ہے کہ گویا دسترخوانِ محبت کا بلاوا آ جاتا ہے۔ دل کی کیفیتیں بدلنے لگتی ہیں، عادتیں اور عقائد سنورنے لگتے ہیں، دل نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور شیطانی حرکتیں دم توڑنے لگتی ہیں۔

درودِ پاک جس بھی مقصد سے پڑھا جائے، کارگر ہے۔ چاہے دنیاوی ضروریات کے لیے ہو، کاروبار میں برکت کے لیے، خواہشات کی تکمیل کے لیے یا پھر آقا ﷺ کی تعلیمات اور غلامی کے حصول کے لیے، اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ضائع نہیں فرماتا۔ جو چاہوگے، وہ عطا ہوتا رہے گا۔

لیکن سب سے افضل یہ ہے کہ دامنِ مصطفیٰ ﷺ کو تھام لیا جائے۔ خاموشی سے محبوبِ کریم ﷺ کے تصورات میں گم ہو جاؤ۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، بس درودِ پاک کا نذرانہ پیش کرتے جاؤ۔ پھر دیکھتے جاؤ کہ کس طرح نوازشوں کا نزول ہوتا ہے۔

بس شرط یہ ہے کہ خاموشی اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ دنیا کا کاروبار تو چلتا ہی رہے گا، مگر تمہیں دائمی زندگی اور دائمی کامیابی نصیب ہو جائے گی۔

دوستو! یہ ڈیوٹی ادا کرتے رہو، اور دوسروں کو بھی راہِ محبت دکھاتے رہو۔

وفاءِ درود پاک

دوستو! جب کبھی کسی سے محبت ہو جاتی ہے، اور اگر وہ واقعی محبت ہو تو انسان کو یا تو پاگل کر دیتی ہے یا پھر کامیاب بنا دیتی ہے۔ مجازی محبت ایک قسم کی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر انسان اصل منزل کی تلاش میں نکل پڑتا ہے، لیکن اکثر لوگ بیچ میں ہی گر جاتے ہیں، یا تھک کر ٹھہر جاتے ہیں، یا واپس پلٹ جاتے ہیں۔

کچھ نایاب اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مراحل عبور کر کے بالآخر منزل پا لیتے ہیں۔ پھر وہ راستے اور منزل کے مصائب سے باخبر ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ بیچ میں کیوں رک گئے؟ اگر رکنا ہی تھا تو پھر سفرِ محبت شروع ہی کیوں کیا؟

دراصل یہ لوگ ناتجربہ کاری کی وجہ سے منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ اگر یہ سفر کسی تجربہ کار استاد کی رہنمائی میں کیا جائے تو راستے کی مشکلات اور منزل کی حقیقت پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہے، پھر پاؤں پیچھے نہیں لوٹتے۔ وہ استاد، جو منزل پار کر چکا ہوتا ہے، اپنے شاگردوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر آپ ایک مرتبہ منزل پر پہنچ کر اس ہستی کو پا لیں اور اگر اسے دیکھ بھی لیں تو پھر کبھی بھی واپس پلٹنے کی خواہش نہیں کریں گے۔ بلکہ ساری زندگی کی آسائشیں قربان کر دیں گے۔ آپ کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ پیچھے مڑنا ہے۔ کوئی اس ہستی کو پا کر یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ واپس پلٹنا ہوتا ہے؟

بس دوستو! درود پاک کی کثرت ہمیں یہی سبق دیتی ہے، اور یہ ایک سیڑھی ہے جس پر چل کر اس منزل کو پایا جا سکتا ہے۔

فنا سے بقا کا راستہ

اے جسمِ فانی! تو بقا کے راز کو سمجھنے کی کوشش کر۔ تو مٹی سے بنا ہوا ہے اسی مٹی سے، جسے ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔

ایک صوفی اس مٹی ماں کو مخاطب کر کے کہتا ہے: "اے باخبر روح! میں نے اپنے محبوب کو دیکھا ہے، اپنے اندر کی آنکھوں سے، قلب کی نگاہوں سے۔

میں نے اپنے دل میں ذکر کا چرخا چلایا، اُس کا نام بار بار پکارا، اور جب میں نے اُسے پا لیا، تو تمام فانی خواہشات مٹ گئیں۔

اسی چرخے کی کثرت سے مجھے چاہت کا دھاگا مل گیا وہ نازک ڈور، جسے میں نے اپنے قلب میں پیوست کر لیا ہے۔

اے جسمِ فنا! تم بھی اس حقیقت کو مان لو، اور فنا سے بقا کی طرف لوٹ آؤ۔"

بس دوستو! یہی پیغام صوفیاءِ کرام کا ہے اور اس راہ پر چلنے والوں کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اُس ہستی سے وابستہ ہو جائیں جو بقا والے رب کے نزدیک محبوب ترین ہستی ہیں ہمارے آقا، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ لہٰذا، ان پر درودِ پاک کی کثرت کو اپنا معمول بنا لو، کیونکہ یہی درود تمہیں فنا سے بقا کی راہ دکھاتا ہے۔

شوقِ درود پاک

یار کے دیدار کی تمنا ہمیشہ صبر آزما اور کٹھن ہوا کرتی ہے۔ جہاں شوقِ جنون اپنی شدت کو پہنچ جائے، وہاں جلنے کا خوف باقی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ پروانے ہمیشہ شمع کے گرد جلنے ہی کے لیے آتے ہیں۔

ایک دیا تبھی جلتا ہے جب اس کی لو ہو، اور لو تبھی روشنی دیتی ہے جب وہ قربانی دیتی ہے۔ ورنہ اندھیرا صرف گھبراہٹ اور وحشت پیدا کرتا ہے۔

جہاں ایسے دیے، ایسی لوئیں، اور ایسے پروانے ہوں جو اپنے وجود کی پروا کیے بغیر صرف روشنی بانٹنے کے لیے جیتے ہوں وہاں کے لوگ یقیناً خوش نصیب ہوتے ہیں۔

اے دوستو! آؤ، اپنی خواہشوں کو جلا کر معاشرے میں روشنی پھیلائیں!

ہمارے آقا، خاتم النبیین ﷺ پر درود بھیجو، کیونکہ درودِ پاک ایک روشن چراغ کی مانند ہے جو نہ صرف دل کو منور کرتا ہے، بلکہ ماحول کو بھی روشن کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، محبوبِ خدا ﷺ کی توجہ، اور اللہ والوں کی صحبت سے ایسے چراغ جلاؤ جو کبھی نہ بجھیں۔

درود پاک کی روشنی

دوستو! ذرا دھیان دیجیے میرے محبوب ﷺ ایک نہ ختم ہونے والی شمع ہیں، وہ آفتاب و مہتاب سے بھی زیادہ روشن چراغ ہیں، جن کی روشنی آج بھی سارے جہان کو منور کر رہی ہے۔

آیئے!

ہم بھی ان کی ذاتِ اقدس سے روحانی، قلبی، جسمانی، اور اخلاقی چراغ روشن کریں۔

اس کے لیے سب سے احسن اور پائیدار راستہ ہے:

کثرت سے درودِ پاک پڑھنا ہے۔

آیئے!

اس رحمتِ عظمیٰ کو، نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر دل و جان سے درود شریف میں مشغول ہو جائیں۔

اِن شاء اللہ تعالیٰ:

سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا جائے گا، کوئی پریشانی قریب نہیں آئے گی، کیونکہ آپ اُس رحمت کے قریب تر ہوتے جائیں گے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"إِنَّ ٱللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ صَلُّوا۟ عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا" (سورۃ الاحزاب: 56)

دل کی صفائی

صوفیانہ خیالات کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

اڇو پاڻِي لُڙُ ڪِيو ڪالُوريو ڪنگَنِ،

اِيندي لَڄَ مَرَنِ، تَنهن سَرَ مٿي هَنجَڙا۔

ترجمہ: صاف پانی کالے کوؤں نے گندا کر دیا اور ہنس جیسے پرندے تو ہمیشہ صاف، سفید پانی کے عادی ہوتے ہیں، اور وہ اب ان کوؤں کی گندگی پر شرمسار ہیں، اور اس گندے پانی کے تالاب پہ آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

دوستو! یہ نظر انداز کرنے والی بات نہیں، بلکہ سوچنے والی بات ہے۔ یہاں شاعر کی مراد یہ ہے کہ اچھے لوگ اس معاشرے میں حیرت زدہ ہو چکے ہیں کہ یہ معاشرہ کس سمت کو جا رہا ہے؟ کسی کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ ہر طرف چاہے مذہبی صفیں ہوں، سیاسی ہوں، سماجی یا کاروباری نفرتوں کا سایہ چھا چکا ہے، اور پاکیزگی، اخلاص، محبت جیسے الفاظ صرف کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ اگر کہیں تھوڑی مقدار میں بھی صاف، سفید پانی (یعنی خلوص، سچائی، عشق، ہمدردی) نظر آئے، تو فوراً وہاں کا پتہ معلوم کرو، وہاں پہنچنے کی کوشش کرو کیونکہ وہی روحانی شفا کا مقام ہے۔ ورنہ اگر آپ مسلسل یہ بے ذائقہ، آلودہ پانی پیتے رہے تو آپ کا روحانی معدہ خراب ہو جائے گا، اور آپ کو شیطانی السر لاحق ہو جائے گا جس کا علاج صرف پرہیز ہے، اور وہ پرہیز صرف صاف پانی (یعنی درود پاک، ذکر، سچ، اخلاق) سے ممکن ہے۔

آؤ میرے بھائیو! درودِ پاک کی کثرت کا صاف اور سفید پانی پیو، اپنی روحانی صحت ٹھیک کرو اور اس شیطانی السر کے شکار معاشرے کو پتہ دے کر انہیں بھی اس بیماری سے بچاؤ۔

تقویٰ اور درود پاک

دوستو! باریش ہونے اور پاک رو ہونے میں فرق ہے۔ پاک رو اور پرہیزگار (متقی) انسان ربّ العالمین کے قریب ہوتا ہے۔ اُس کا دل نرم، مہربان اور دوسروں پر ترس کھانے والا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے سے کانپ اٹھتا ہے۔ جبکہ صرف ظاہری ڈریسنگ والے لوگ اکثر لاگَرض (خود غرض) ہوتے ہیں،

ان کا سارا رجحان اپنی دولت اور شان بنانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ مخلوقِ خدا سے کم وابستہ ہوتے ہیں، سوائے اپنے مفاد کے۔ تقویٰ انسان کے دل سے تکبر کو نکال دیتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے صوفیائے کرام درودِ پاک کی کثرت کی تلقین فرماتے ہیں۔ کیونکہ درود شریف انسان کو نبیِ کریم ﷺ کے قریب ترین راستے پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے جہاں سے عاجزی، انکساری، درگزر، اور روکھی سوکھی بانٹ کر کھانے کا سبق ملتا ہے۔ یہی تعلیم ہمیں سیرتِ النبی ﷺ میں ملتی ہے۔ یہ تقویٰ دراصل نعمتِ ربی ہے، جس کے سبب سجدہ بھی اُس ربِ واحد کو حاضر و ناظر جان کر ادا کیا جاتا ہے۔ ایسا انسان کبھی خود غرض اور متکبر نہیں ہوتا، وہ دل کی گہرائی سے روتا ہے، اور اُس کی آنکھوں کے آنسو، اُس کے دل کی دردمندی کا ثبوت ہوتے ہیں۔

بابِ نورِ محمدی ﷺ۔ درود کی برکتوں کا راستہ

دوستو! یقین کریں، میرے محبوب ﷺ ایک نہ ختم ہونے والی شمع ہیں۔ آپ ﷺ سورج و چاند سے زیادہ روشن چراغ ہیں، جن کی روشنی سارے جہان کو منور کر رہی ہے۔ آئیں! ہم بھی اپنی روح، دل، جسم اور اخلاق کو اُن کے نور سے روشن کریں۔ اس کا بہترین اور پائیدار راستہ "کثرت سے درود پاک پڑھنا" ہے۔ آئیں! اس رحمت کو نعمت سمجھ کر درود شریف پڑھنے میں لگ جائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، سب کچھ بہتر ہوتا جائے گا، اور کوئی پریشانی قریب نہیں آئے گی، کیونکہ آپ ﷺ کی رحمت کے جتنا ہم قریب ہوں گے، اتنی ہی آسانیاں ملتی جائیں گی۔

باطنی سفر

کچھ لوگ سیر و تفریح کے شوقین ہوتے ہیں۔ انہیں گھومنے پھرنے، مختلف تفریحی مقامات دیکھنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ چاہے وہ پہاڑی علاقے ہوں، ریگستان ہوں، یا سرسبز و شاداب وادیاں یہ سب مناظر انسان کو وقتی سکون ضرور فراہم کرتے ہیں۔

لیکن کائنات کے ان حسین مناظر سے بھی کہیں زیادہ وسعت آمیز اور حیرت انگیز مناظر اُس وقت سامنے آتے ہیں، جب انسان اپنے اندر کا سفر شروع کرتا ہے۔

اگر انسان اپنے باطن کی طرف سفر کرنا سیکھ لے، تو وہ ایسی عظیم "تفریح گاہ" تک پہنچ سکتا ہے، جہاں اُس کی روح ایک خاص قسم کے سکون، اطمینان اور راحت کی کیفیت میں چلی جاتی ہے۔

وہ وہاں ایسے روحانی عجائبات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جہاں عقل اور علم کی تمام حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

ایسے سفر کو "روحانی سفر" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ سفر ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ یہ صرف اُن کے لیے ممکن ہے جنہیں "عطا" نصیب ہو اور عطا صرف ربِ کریم کے فضل اور انسانیت کے سردار حضرت محمد ﷺ کی توجہ و اجازت سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی لیے درودِ پاک ﷺ اس روحانی سفر کے اجازت نامے کے طور پر استعمال ہوتا ہے ایک روحانی درخواست کی صورت میں، تاکہ انسان کو اس باطنی اور نورانی سفر کی اجازت نصیب ہو سکے۔

بابِ عشق

عشق، فریب اور نجات کا راستہ

دوستو! پرانے وقتوں میں دریاؤں پر پل نہیں ہوا کرتے تھے، اور دریاؤں کے رخ اور راستے وقت، موسم اور ان کی موج مستی کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ اُس وقت کے لوگ کشتیاں استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی اکیلا آدمی ایمرجنسی میں ہو تو وہ پکا مٹکا استعمال کرتا تھا، بالکل ایسے ہی جیسے آج کل کے لوگ شوقیہ طور پر ٹائر یا ٹیوب پر تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

آپ نے سندھ کی مشہور لوک داستان "سہنی میہار" کے واقعات یقیناً سنے ہوں گے۔ سہنی اپنے میہار کے عشق میں پکے مٹکے پر دریا پار کرتی تھی۔ لیکن ایک دن اُس کی حاسد سہیلیوں نے پکے مٹکے کی جگہ کچا مٹکا رکھ کر اسے دھوکا دیا۔ بارشوں کی ایک تاریک رات میں، جب دریا پوری طغیانی پر تھا، وہ بیچاری اپنی سہیلیوں کی سازش کے نتیجے میں ڈوب گئی۔ اُس کا قصور بس یہ تھا کہ وہ عشق میں مدہوش ہو کر کچے اور پکے کا فرق نہ سمجھ پائی۔ شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

کارِي رات ڪَچو گھڙو
جا گِھڙِي وسندي مينھَن.
هَلو تہ پُڇئون سهِٽِي،
جا ڪرِ جاٽي نينھَن.
جنھن کي راتو ڏينھَن،
ميهارُ ئي مَنَ ۾.

اسی طرح دنیا کی زندگی ایک اندھیری رات اور طوفانی بارش کی مانند ہے، جہاں انسان کے ہاتھ میں صرف ایک "مٹکا" ہے، یعنی ایک سہارا ہے۔ اگر وہ مٹکا "کچا" ہوا (یعنی ناپائیدار خواہشات، دنیاوی لذتیں، جھوٹی محبتیں)، تو انسان ڈوب جائے گا۔

شاہ بھٹائیؒ کہہ رہے ہیں کہ سہنی کا قصہ دراصل ایک علامت ہے۔ اس نے عشقِ میہار میں ہوش کھو کر یہ نہ پہچانا کہ کون سا سہارا کچا ہے اور کون سا پکا۔ اسی طرح انسان اگر دنیاوی محبتوں اور نفسانی خواہشات کو سہارا سمجھے تو آخرت کی طوفانی رات میں ڈوب جائے گا۔ اصل محبت وہ ہے جو انسان کو "حق" تک لے جائے۔ اگر دل میں "میہار" یعنی اصل محبوب (اللہ یا اُس کے برگزیدہ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کا عشق ہو، تو پھر بارش، اندھیری رات اور طوفان بھی نقصان نہیں دے سکتے۔

دوستو! یہ دنیا بھی ایک دریا کی مانند ہے۔ اس کی آخری تیراکی قبر اور برزخ میں ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ فطری طور پر دنیا میں رہنے کے طریقے دوسروں سے سیکھ لیتا ہے، پھر انہیں استعمال کرتا رہتا ہے۔ اب آپ غور کریں: اگر آپ نے صرف دنیا کی خواہشات کو اپنا "میہار" سمجھا اور یہ نہ پہچانا کہ کون سی خواہشیں "پکی" ہیں اور کون سی "کچی"، تو آخری تیراکی کے وقت آپ کی سہیلیاں یعنی نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ پھر قبر اور برزخ میں آپ گھاٹے میں رہیں گے۔

لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ تیراکی سیکھیں، اپنی سہیلیوں کو پہچانیں، دھوکے اور فریب سے بچیں۔ اگر آپ کا عشق آپ کو "حق" کی طرف کھینچتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ دونوں جہان میں کامیاب اور سرخرو ہو گئے۔ کیونکہ یہ دنیا اور اس کا سارا سامان فانی ہے۔ ایک نہ ایک دن سب کو غوطہ لگانا پڑے گا۔ بس پکا مٹکا استعمال کریں۔ اور میرے خیال میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہی وہ پکا مٹکا ہے، جو اگر درودِ پاک کی کثرت کی بھٹی میں اچھی طرح پکایا جائے تو آپ کو ڈوبنے نہیں دے گا۔

بقاءِ عشق

اے دوست! اگر تم اپنی تمنا اور نفس کو مٹانا چاہتے ہو، تو کسی عاشق کو ڈھونڈو اور اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ اپنے فارغ وقت میں اولیاءِ کرام کے درباروں کا رخ کرو۔ وہاں جا کر دربار میں بیٹھو، پرسکون ہو جاؤ اور خاموشی سے اس ماحول کا جائزہ لو۔ تم دیکھو گے کہ وہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، لیکن تم ان سب سے بالکل بے پرواہ ہو کر بیٹھے رہو اور غور کرتے رہو۔

پھر اپنے دل سے پوچھو: یہ مزار مٹی کا بنا ہوا ہے، اور اس میں صاحبِ مزار کا جسم بھی مٹی کا ہے، جس نے امرِ الٰہی کو تسلیم کیا تھا۔ مگر دیکھو! مزار کے باہر بھی قبریں ہیں، جو کھلے آسمان تلے بغیر چادروں کے ہیں، لیکن اس مزار کی قبر پر چادریں چڑھائی جا رہی ہیں، خوشبوئیں لگائی جا رہی ہیں، تلاوتِ قرآنِ کریم جاری ہے، اور وقتاً فوقتاً منتیں مانی جا رہی ہیں۔

آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ جب تم یہ سب دیکھو، تو سمجھ لو کہ اس مزار میں یقیناً کوئی عاشقِ حقیقی سویا ہوا ہے——وہ عاشق جس نے دنیا میں اپنے آپ کو مٹا کر اُس حقیقت سے محبت کی جو حیُّ القیوم ہے۔ اسی محبت کے ذریعے اس نے فنا سے بقا تک کی خوشبوئیں پا لیں۔

آج دنیا بھر کے دردمند لوگ اس کی خوشبو لینے آتے ہیں، اس حیُّ القیوم سے جس کو اس بندے نے پا لیا تھا۔ اب تم بھی اس خوشبو کو اپنی معشوقہ بنا لو، اسے اپنے سینے میں بسا لو، اور اپنے رب سے ایسی ہی خوشبو کی چاہت کرو۔ جب دلبر اس عاشق سے راضی ہوا، تو تم سے بھی راضی ہو جائے گا۔ بس اپنے دل کا تعلق اس سے جوڑے رکھو، اور وہ راستے تلاش کرو جو بندگانِ خدا نے اختیار کیے تھے۔ آج وہ لوگ زوال میں بھی لازوال دکھائی دیتے ہیں، اپنے مالک کے فضل و کرم سے۔

اب تم بھی اس رب کے ہو جاؤ۔ مگر ذرا ٹھہرو! تم اکیلے نہیں جا پاؤ گے، سوائے محبوبِ خدا ﷺ کے سہارے کے۔ بس یہی وہ راستہ ہے جس پر بندے نوازے جاتے ہیں —— وہ بندے جنہوں نے اپنے محبوب ﷺ کا دامن تھام رکھا ہے۔ لہٰذا درودِ پاک پڑھنے اور پڑھانے کی کثرت کرو، کیونکہ اسی میں قربِ الٰہی کا راز پوشیدہ ہے۔

مقامِ عشق

دوستو! کبھی کبھی آپ نے بچوں کو دیکھا ہوگا، وہ نئے نئے کھلونوں کو توڑ کر انہیں دوبارہ جوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور سارا وقت انہی میں مشغول رہتے ہیں یہاں تک کہ یا تو کھلونا بالکل ناکارہ ہو جائے، یا ان کا دھیان کسی دوسری طرف چلا جائے۔

اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بھی کوئی مستری کسی دیوار کا پلستر کرتا ہے، تو سب سے پہلے پرانے پلستر کو رگڑ کر ہٹا دیتا ہے۔ وہ اس پر ٹک لگانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اگر دیوار نئی ہو تو وہ اس کی اینٹوں کو پانی سے سیراب کرتا ہے۔

ان کے درمیان اگر مٹی ہو تو اسے نکال دیتا ہے، اور اگر سیمنٹ لگا ہو تو اس کی رگڑائی کرتا ہے۔ بغیر رگڑائی، ٹک لگانے اور پانی کے پلستر کبھی نہیں جم سکتا۔ اسی طرح اگر کسی دیوار پر آئل پینٹ کروانا ہو، تو پہلے والا رنگ لازمی اتارا جاتا ہے۔ اور اگر پہلی بار پینٹ ہو رہا ہو، تو سیمنٹ پر رگڑائی ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح حکیم صاحبان بھی پہلی کھائی ہوئی دوا کا اثر جلابوں کے ذریعے زائل کروا کر نئی دوا دیتے ہیں تب ہی نئی دوا اثر دکھاتی ہے۔

بالکل ایسے ہی، جب ایک ان پڑھ بچہ علم حاصل کرنے لگتا ہے، تو اسے الف یعنی صفر (Zero) سے آغاز کروایا جاتا ہے۔ اسی بچے کی طرح، ایک طالبِ معرفت کو اس کا صوفی استاد بھی ابتدا میں اس کی جسمانی و نفسی ساخت کو زائل کرواتا ہے۔ وہ اس کے تمام باطنی و روحانی اعضاء کو توڑ مروڑ کر ان میں چھپے ہوئے ٹیڑھ نکالتا ہے، پھر نئے سرے سے ان کو فٹ کر کے سیٹنگ کرتا ہے بالکل جیسے ایک مستری پہلے دیوار کو پانی سے تر کرتا ہے۔

دوستو! ایسے ہی ایک صوفی استاد درودِ پاک کی کثرت سے اپنے مرید کے باطن کی گندگی کو دھوتا ہے۔ پھر ذکرِ قلبی کے ذریعے اس پر ٹک لگاتا ہے ـــــ یعنی اس کے اندر دنیاوی صبر، برداشت، تحمل پیدا کرتا ہے۔ غصہ، حسد، کینہ، اور بغض کو نکال کر جب وہ دل بالکل پاک ہو جاتا ہے، تب وہ رموزِ حقیقت سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

پھر کشف کی صورت میں حجاب کے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔ ایک خاموشی کا سماں بندھ جاتا ہے سب کچھ جان کر بھی وہ بے خبر ہو جاتا ہے۔ اب وہ صرف رضائے الٰہی پہ راضی رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے مقامِ عشق کہا جاتا ہے۔

دوستو! عشق نہ رتبہ دیکھتا ہے، نہ دنیاداری۔ نہ عشق میں کسی کو ڈانٹنے یا ڈسنے کی گنجائش ہوتی ہے، اور نہ ہی عشق کی کوئی سرحد یا حدبندی ہوتی ہے۔ یہ سب تو انسان کے اندر کی انائیت اور خود غرضی کے مظاہر ہیں۔

کوئی مجھ سے آگے نکل جائے گا تو میری عزت میں فرق آ جائے گا، پھر میرا کیا ہوگا؟ میں تنہا رہ جاؤں گا!

یہ سب نفس کی باتیں ہیں۔ عشق والے تو خود ہی تنہا ہوتے ہیں۔ ان کے پاس تو صرف دعائیں دینے کا خزانہ ہوتا ہے نہ وہ نفرت کرتے ہیں، نہ بددعائیں دیتے ہیں۔ اگر کوئی بددعا دیتا ہے، تو وہ شیطان کا پیروکار ہے۔ ایسا شخص روحانیت اور عشق سے ناآشنا ہے۔

دوستو! ثابت قدم رہو۔ اپنے آپ کو اپنے نفس سے جدا کر دو۔ اس سوچ کو مٹا دو کہ میں بھی کچھ ہوں۔ جب تک تمہارے اندر "میں، میں" کی رٹ لگی رہے گی، تب تک تم شیطان کے شاگرد رہو گے۔

انسان کا شاگرد بننے کے لیے، پہلے خود انسان بننا ضروری ہے۔ یہی عشق ہے یہ صوفیاء کرام کی نشانی ہے، اور اماموں کی نسبت ہے۔ سنبھل جا اے انسان! صبر کے ساتھ، اپنائیت کے ساتھ، انسانوں سے محبت کرنا سیکھ۔

عشق کا راستہ

انسان پھر بھی بیچارا انسان ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کی ساخت ہی میں خطا شامل ہے۔ وہ حسن و صورت کا دیوانہ بن جاتا ہے۔

کوئی بھی حسین چیز اسے اپنا گرویدہ بنا سکتی ہے۔ کبھی کسی لمحے سامنے والے انسان کی کوئی بات، کوئی انداز، کوئی چال، کوئی آنکھ، یا کوئی چہرہ اس کے دل کو چھو جاتا ہے۔ وہ اس میں کھو جاتا ہے اور اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔

یہ محبتیں کبھی طویل ہوتی ہیں، کبھی عارضی، اور اکثر تبدیلی کے تابع بھی رہتی ہیں۔

جب وہ محبت میں آگے بڑھتا ہے، تو کبھی اپنی زندگی کو مخاطب کرتا ہے،

کبھی اپنے مٹی سے بنے جسم سے کہتا ہے: "اے میری جان، اے میری پہچان! اب میں بہت رنجیدہ ہوں، میرا دل دکھ سے بھرا ہوا ہے، میرا ہر لمحہ آنسوؤں میں گزرتا ہے۔"

پھر وہ جان لیتا ہے کہ اب اس کی محبت انسان کی صورت سے نکل کر اُسے بنانے والے کی طرف گامزن ہو گئی ہے۔

وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس خالق کو پانے کا راستہ کیا ہے۔ اب وہ اس کے محبوب ﷺ کے ذریعے اُس خالق سے واسطہ جوڑنا چاہتا ہے۔

اسی لیے وہ اس ہستی پر درود پاک کی کثرت شروع کر دیتا ہے ـــــ کیونکہ وہ جان لیتا ہے کہ درود ہی وہ وسیلہ ہے جس سے محبوبِ حقیقی تک رسائی ہوتی ہے۔

تفسیرِ عشق

آج کی وسیع دنیاوی مصروفیات سے بھری ہوئی زندگی میں آپ کو ایسے کئی لوگ ملیں گے جو دفاتر میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوں گے۔ وہ زندگی کی گہما گہمی میں مصروف، سوٹ بوٹ پہنے، اور ٹائی لگائے ہوئے نظر آئیں گے، مگر ان کے دل قلندری صفات کے حامل ہوں گے۔ جب آپ کا ان سے واسطہ پڑے گا، تو آپ کو ایک اور ہی دنیا کی جھلک دکھائی دے گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ عام لوگ نہیں ہیں۔ ان کی مصروفیات محض ذریعۂ معاش ہیں، لیکن ان کے دل و دماغ کسی اور ہی نگرانی میں تربیت پا رہے ہیں۔ ان کی کیفیات دن رات بدلتی ہیں، اور ان کے مزاج میں ایک خاص روحانی سکون و استغنا دکھائی دیتا ہے۔ اگر کبھی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو، تو ادب و احترام سے پیش آئیں، ان کی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کا وقت ضائع نہ کریں۔ یہ لوگ عام نہیں ہوتے، ان کا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔

ہم اکثر "عشق" کی باتیں سنتے ہیں۔ لوگ کسی کی سیرت سے، کسی کی صورت سے، کسی کی دولت، جائیداد یا اولاد سے محبت کرتے ہیں۔ یہ سب عشق، عارضی اور دنیاوی نوعیت کے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایک قسم ان صوفیاء کرام کی بھی ہے جو عشق کی باتیں اپنی تقاریر، اشعار اور تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر وہ لوگ نمایاں ہوتے ہیں جن کی سوچ "قلندری" ہوتی ہے۔ ان کے کردار، انداز اور حرکات میں ایک عجیب سی ہلچل، ایک کشش اور روحانی تاثیر ہوتی ہے۔ کبھی وہ جذب کی حالت میں ہوتے ہیں، تو کبھی کشف کی کیفیات میں۔

کسی نے قلندری مزاج رکھنے والے، حضرت شمس تبریز کی تعلیمات سے متاثر ایک فقیر سے پوچھا: "فقیر سائیں! ذرا بتاؤ عشق کی تفسیر کیا ہے؟" فقیر نے مسکرا کر کہا:

"بیٹے! عشق کی تفسیر صرف ایک عاشق ہی جان سکتا ہے۔"

رومی ہوں یا لال شہباز قلندر، ڈاکٹر علامہ اقبال ہوں یا خواجہ معین الدین چشتی، یا پھر ہمارے اساتذہ بابا سائیں احمد علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ اور مست سائیں محمد علی قلندری یہ سب عشق کی چلتی پھرتی تفسیر ہیں۔ آج اُن کی زندگی، اُن کے اشعار، اور تعلیمات ہی عشق کی اصل تشریح ہیں۔

عشق کی باتیں آج کل عام سنائی دیتی ہیں۔ ہر کوئی "عشق، عشق" کرتا نظر آتا ہے: کوئی کسی کی صورت سے، کوئی کسی کی ثروت سے، کوئی مال و جائیداد سے، کوئی منصب سے، تو کوئی اولاد یا دیگر دنیاوی نعمتوں سے عشق کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر یہ سب عشق نہیں بلکہ رسمی، دنیاوی، عارضی اور ظاہری محبتیں ہیں، جو وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں عاشقوں کی ایک اور قسم بھی ہے وہ ہے صوفیاء کرام کی قِسم، جو عشق کی باتیں نہ صرف اپنی تقریروں، اشعار اور نظم و نثر میں کرتے ہیں، بلکہ اپنی زندگیوں میں بھی عشق کو عملی طور پر جیتے ہیں۔

ان کے اندازِ فکر میں ایک خاص قسم کی قلندری کیفیت ہوتی ہے کبھی ان پر جذب کی حالت وارد ہوتی ہے، اور کبھی کشف و کرامات کی صورت میں ایک روحانی ہلچل نظر آتی ہے۔ ان کا کردار، حرکات، اور طور طریقے دنیا سے الگ، منفرد اور پراثر ہوتے ہیں۔ ایک بار کسی شخص نے قلندرانہ سوچ رکھنے والے ایک درویش سے، جو حضرت شمس تبریزؒ کی تعلیمات سے متاثر تھا، پوچھا: "فقیر سائیں! ذرا یہ تو بتاؤ کہ عشق کی تفسیر کیا ہے؟" فقیر نے گہری نگاہ سے دیکھا، ہنسا، اور نرمی سے بولا: "بیٹے! عشق کی تفسیر تو صرف وہی بتا سکتا ہے، جو عشق کر چکا ہو۔"

"پھر چاہے وہ مولانا رومؒ ہوں، حضرت لعل شہباز قلندرؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، علامہ اقبالؒ، بابا سائیں احمد علی قریشیؒ، یا مست سائیں محمد علی قلندریؒ ہوں. یہ ہستیاں تو خود عشق کی چلتی پھرتی تفسیر تھیں۔ ان کا کردار، اشعار اور تعلیمات یہی سب عشق کی سچی تفسیر ہیں۔

رازِ عشق

دوستو! جب محبت اُس مقام کو چھونے لگتی ہے جہاں خلوص اور اخلاص کی آمد و رفت بغیر وقفے کے جاری رہتی ہے، تو وہاں رکاوٹیں آزمائشوں کی صورت میں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب ایک چاہنے والا سب رسم و رواج توڑ کر اپنی محبت کو پانے کے لیے کبھی حضرت سچل سرمستؒ کی طرح سارا "سچ" بن کر بولنے لگتا ہے، اور کبھی حضرت بابا بلھے شاہؒ کی مانند پیر و مرشد کے در پر گھنگرو باندھ کر محبت کے جام میں مستی کا وہ عالم پیدا کرتا ہے کہ دنیاوی رسمیں، رشتے، اور نسب بھول جاتا ہے۔ بس ایک ہی صدا بلند ہوتی ہے "گھونگھٹ کھول، دیدار کرا دے!" یہ دیدار کتنا قیمتی عمل ہے، یہ وہی جانتا ہے جس نے عشق کا جام پیا ہو۔ مگر جب وہ عاشق ہوش میں لوٹتا ہے اور بہت کم لوٹ پاتے ہیں تو وہ وقت کا قلندر کہلاتا ہے۔ چاہے وہ خود کو کتنا ہی چھپائے، مگر عشق کی خوشبو تو بکھر ہی جاتی ہے کبھی کردار کی صورت میں، کبھی الفاظ کے روپ میں، اور کبھی پلکوں میں چھپے آنسوؤں کی قطاروں میں۔

محبت والا ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ رازِ عشق کو راز ہی رکھے، لیکن محبوب جب چاہتا ہے تو اسی راز کو لوگوں کے درمیان بانٹ دیتا ہے تاکہ کچھ خاص لوگوں کے ذریعے یہ تعلق ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہے، اور محبت کا یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو۔ ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں جو رازِ عشق کے امین ہوتے ہیں۔ وہ خود کو عام سمجھتے ہیں، مگر ان کے سینوں میں قیمتی ورثہ چھپا ہوتا ہے۔ جہاں کوئی لائق طالبِ عشق مل جائے، وہ اُسے تھوڑی سی خوشبو سونگھا دیتے ہیں۔

دنیا اُنہیں الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے، مگر اُن کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے عمر بھر کی ریاضت اور گہری فکر چاہیے۔ دنیا آج تک نہ حضرت علیؑ کو پہچان سکی، نہ اُن کے پاک اہلِ بیت کو۔ تو پھر وہ قلندر کے منصبِ عشق کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟ ایسی جگہوں پر محبتِ الٰہی کے اسرار کا ذکر کرنا کبھی کبھی بے ادبی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ عشق کی توہین کے مترادف ہے۔

عشق رسول ﷺ

تصوف کی باتیں کرنے کا مقصد دراصل عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پانا ہوتا ہے۔ تصوف پر عمل کرنے والے کو "صوفی" کہا جاتا ہے۔

تصوف در حقیقت اُن دنیاوی غموں اور خواہشاتِ نفسانی سے خود کو محفوظ رکھنے کا نام ہے، جو انسان کے باطن کو آلودہ کرتی ہیں۔

صوفی وہ ہوتا ہے جس نے اپنے آپ کو عشقِ الٰہی کے غسل سے یوں پاک کر لیا ہو کہ درودِ پاک کی کثرت سے اس کا باطن بھی صاف و شفاف ہو جائے، اور اس کے کردار سے بھی معاشرے کو فائدہ پہنچے۔

وہ فقط رسم و رواج کا قائل نہیں ہوتا، بلکہ ہر اُس عمل کا طالب ہوتا ہے جس سے اس کا باطن پاکیزہ بن جائے۔

صوفی اپنی زندگی میں تمام مادی خواہشات کو ختم کر کے مرنے سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔

اس کے اندر ایک ایسی آگ جلتی ہے جو نورِ بصیرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اُسے روحانی بشارتیں نصیب ہوتی ہیں، اور وہ سماعتِ روحانی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

صوفی اپنی تمام تر حکمت و بصیرت کو صرف تبلیغِ دین اور اصلاح معاشرہ میں خرچ کرتا ہے، نہ کہ ذاتی مفاد کے لیے۔

ایسا نایاب انسان صوفی کہلاتا ہے — چاہے دنیا اُسے کچھ بھی سمجھے۔

صوفی وہ ہوتا ہے جس نے اپنی "خودی" کو فنا کر کے "عاجزی" کو اختیار کیا ہو، اور اپنی "انا" کی تمام دیواریں گرا کر محض "ایک انسان" ہونے کا عملی مظاہرہ کیا ہو۔

بس، وہی شخص صوفی ہوتا ہے۔

رحمتِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دوستو! تصوف کی باتیں کرنے کا مقصد دراصل عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل کرنا ہے۔ تصوف پر عمل کرنے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ وہ دنیاوی غم، جن کی وجہ سے انسان کے اندر خواہشاتِ نفسانی جنم لیتی ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا نام تصوف ہے۔

صوفی وہ انسان ہے جس نے اپنے آپ کو غسلِ عشق، یعنی درودِ پاک کی کثرت سے اس قدر پاک صاف کر لیا ہو کہ نہ صرف اس کا باطن روشن و شفاف ہو جائے بلکہ اس کے کردار سے بھی معاشرے کے افراد کو فائدہ پہنچے۔ وہ فقط رسم و رواج کا قائل نہیں ہوتا بلکہ ہر اس عمل کا متلاشی ہوتا ہے جس سے اس کا باطن پاکیزہ ہو جائے۔

صوفی اپنی زندگی میں تمام مادی خواہشات کو مردہ کر کے مرنے سے پہلے ہی موت کا مزہ چکھ لیتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی آگ جلتی ہے جو آخرکار نورِ بصیرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسے بشارت اور سماعتِ روحانی نصیب ہو جاتی ہے، اور وہ اپنی تمام حکمت و دانش صرف تبلیغ اور اصلاح معاشرہ میں صرف کرتا ہے، نہ کہ ذاتی مفاد کے لیے۔

ایسا نادر انسان ہی صوفی کہلاتا ہے، چاہے دنیا اسے کچھ بھی سمجھے۔

جس نے اپنی خودی کو ختم کر کے عاجزی اختیار کر لی ہو، "میں" اور "تو" کی تمام رٹیں چھوڑ کر صرف ایک انسان ہونے کا عملی دعویٰ کیا ہو ـــ وہی حقیقی صوفی ہے۔

وفاءِ محبت

یہ قانونِ فطرت ہے کہ محبت جس سے بھی کی جاتی ہے، وہ یا تو اس کے نام سے، یا اس کے کردار سے متاثر ہو کر کی جاتی ہے، یا پھر اتفاقاً اس کے چہرے کو دیکھ کر جنم لیتی ہے۔

پھر انسان بے اختیار اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ ظاہر ہے، اس سفر میں دنیاوی تکالیف آتی ہیں، رکاوٹیں پیش آتی ہیں، لیکن آخر میں قصوروار محبت کرنے والا ہی ٹھہرتا ہے۔

جس سے محبت کی جائے، اس سے شکایت کرنا دراصل محبت کی نفی ہے۔

اگر شکایت ہی کرنی تھی تو پھر محبت کیوں کی؟ اور اگر محبت کی ہے، تو پھر خاموشی ہی اس کی زبان ہونی چاہیے۔

یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ شخص جس سے محبت کی جائے، زندگی میں کبھی نہ ملے۔ مگر عشق کا تقاضا یہ ہے کہ خواہش ترک نہ کی جائے۔ اگر ترک کر دی تو پھر وہ محبت نہیں، کوئی وقتی لگاؤ ہے۔

یہاں تک کہ جب ملکُ الموت کا وقت آئے، تو دل میں ایک عجیب سی خوشی جاگ اٹھتی ہے کہ اب شاید ملاقات قریب ہے۔ محبت کو ہمیشہ آنکھوں کے آنسوؤں اور وصال کی مسکراہٹ کے بیچ رہنا چاہیے۔

بس اسی امید اور جدوجہد میں کہ کاش! ایک جھلک، ایک نظر، دور سے ہی وہ دکھائی دے جائے، تو سارے دردِ جدائی ختم ہو جائیں۔

دوستو! یہی تو صوفیانہ طرزِ زندگی کا آغاز اور انجام ہے۔ اس راہ پر لگ جاؤ، پھر کبھی پلٹنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ اپنی زندگی میں درودِ شریف پڑھنا اور پڑھانا ہی اپنا مقدر سمجھ لو، باقی یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ کب اور کس کو اپنا بنا لیں۔

سلیقۂ محبت

دوستو! ہر کوئی کسی نہ کسی طرح محبت کا دعویٰ کرتا رہتا ہے۔ یہ محبتِ مجازی ہوتی ہے، جس کے کئی رنگ اور روپ ہوتے ہیں کبھی سیرت اور صورت کے خد و خال میں، کبھی تعمیراتی نقش و نگار میں، کبھی شہرت کے دیدار، اسٹائلش زندگی یا جائیداد و اقتدار کی رسّہ کشی میں۔

مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں محبت کے بغیر کوئی کام مکمل نہیں ہوتا۔ چاہے وہ تعلیم کی جستجو ہو یا تربیت کا اہتمام ہر شوق اور ذوق کے پیچھے ایک لگاؤ چھپا ہوتا ہے، اور یہی لگاؤ آگے چل کر عشقِ حقیقی کی بنیاد بنتا ہے۔

معاشرے میں حقیقی محبت ان ساری ظاہری محبتوں کے پیچھے خاموشی سے انتظار کرتی ہے، کہ جب انسان کے دنیاوی شوق تھک جائیں، تو وہ اُسے اپنی طرف کھینچ لے۔ مگر یہ سب نصیب کی بات ہے۔ جسے مالکِ حقیقی چاہتا ہے، اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

ہر طالب طلب تو کر سکتا ہے اور یہ اس کا انسانی حق ہے۔ لیکن یاد رکھو، سفر کرنا آسان ہوتا ہے، مگر منزل تک پہنچنا ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوتا۔

تیاریاں تو سب کی ایک جیسی نظر آتی ہیں، مگر باطنی علوم، اندر کی کیفیت، اور نورِ فہم صرف اُنہیں عطا ہوتے ہیں جو اپنے محبوب کو محبوب سمجھ کر اپنے قلب اور باطن کو سنوارتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو صرف لفظوں میں نہیں، بلکہ اپنے وجود میں عشق کو سمو لیتے ہیں۔ ظاہری رنگ و روپ اور ہار سنگھار تو ہر کوئی کر لیتا ہے، مگر محبوبِ حقیقی اُس کو قریب کرتا ہے جس کے گلے میں عاجزی کا پٹا بندھا ہو ظاہری نہیں، بلکہ باطنی عاجزی۔ ایسے قیمتی اور نادر انسانوں کو راہِ تصوف میں صوفیاءِ کرام کہا جاتا ہے۔

نمازِ عشق

روزہ، نماز یہ تمام اسلام کے فرائض ہیں۔ یہ نیکیوں کی ابتدا ہیں، لیکن تکبر اور غرور ایسی دیمک ہیں جو ان تمام نیکیوں کو اندر ہی اندر کھا جاتی ہیں۔

ایسا سوچنا کہ "میں نیک ہوں اور دوسرا شخص نیک نہیں"، اور اسی بنیاد پر اُسے حقارت کی نظر سے دیکھنا یہ رویہ انتہائی خطرناک ہے۔

تمہیں کیا معلوم کہ وہ شخص راتوں کو اللہ کے حضور جاگتا ہو، کسی کا حق نہ مارتا ہو، جھوٹ نہ بولتا ہو، ذخیرہ اندوزی سے بچتا ہو، اور بدکاری سے اپنے آپ کو روکتا ہو؟ یہ سب عمل صرف اور صرف اللہ کے خوف اور تقویٰ سے ہی ممکن ہیں۔

اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا یہ شیطان کی صفت ہے۔ اس بیماری سے بچنے کے لیے درودِ پاک پڑھنے اور اس کو پھیلانے کی کوشش کیجیے۔

یہ دراصل انسان کو انسان سمجھنے اور اس کے دل کو نرم کرنے کی تربیت ہے۔

جب دل نرم ہو گا، تو نماز بھی محض ایک فرض نہیں، بلکہ "معراجُ المؤمنین" بن جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ایک محب سے ایک محبوب تک کا سفر

ہزاروں قدموں کے سفر میں، راستے کی مشکلوں اور دنیاوی غموں کو سہتے سہتے، وہ تھکا ہارا، مارا مارا پھرتا ایک محفلِ درود پاک میں پہنچا شاید یہ اس کے نصیب میں لکھا تھا۔

وہ محفل اُس رب کے حضور تھی۔

وہ بے چارہ وہاں پہنچ کر پچھلی صف میں بیٹھ گیا، جہاں درود پاک پڑھا جارہا تھا۔

وہ بھی آہستہ آہستہ، دل کے سکون کے ساتھ، سب کے ساتھ درود پڑھتا جارہا تھا۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوبِ مکرم ﷺ کو اُس کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اسے ان گنت لوگوں میں سے چن لیا۔ اسے درود پاک پڑھنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے منتخب فرمالیا۔ یوں اس کے نصیب کے دروازے کھل گئے۔ بے شک، جب رب کسی کو اپنی رحمت میں داخل کرنا چاہتا ہے، تو خود اس کے لیے انتظام فرمادیتا ہے۔

رشک آتا ہے مجھے ایسے جوانوں پر جنہوں نے ایسے پاکیزہ راستے دکھانے کے لیے محفلوں اور دعوتوں کا اہتمام کیا ہے۔ جب سارا عالم غفلت کی نیند میں سویا ہوتا ہے، تب یہ جوان دیدارِ روحانی کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ جہاں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، وہاں روشنی کا ایک چراغ جلتا ہے اور بھٹکے ہوئے دل اس روشنی کی طرف لپکنے لگتے ہیں۔

ان کے اندر اچانک خودداری اور بیداری کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، جو آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹادیتی ہے، اور دل میں ایک نور کا چراغ روشن کردیتی ہے۔

لوگ بے فکری کی نیند سو رہے ہوتے ہیں،

مگر یہ خاص بندے اپنی جستجو میں مگن رہتے ہیں۔

جب دعاؤں کے کلمات بلند ہوتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں، اور ان کے نصیب سنور جاتے ہیں۔

وہی جو دو جہانوں کا سردار ہے ﷺ، اس نے اپنی غلامی عطا فرمادی

سب غم، سب قیدیں چھوٹ گئیں۔

ٹوٹا ہوا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا،

ساری آزمائشیں ختم ہو گئیں،

مقدر کھل گیا۔

اب دل یہی چاہتا ہے کہ بس درودِ پاک ہی پڑھتا رہوں،

اور اسے دوسروں تک پہنچاتا رہوں

تاکہ وہ مسکراہٹ حاصل ہو جائے،

جس نے مجھے اپنی غلامی بخشی ہے۔

انسانیت کا عشق

دوستو! عشق نہ رُتبہ دیکھتا ہے، نہ دنیاداری۔ نہ کسی کو ڈسنا جانتا ہے، نہ ڈانٹنا۔

عشق کی نہ کوئی سرحد ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی حد بندی۔ یہ سب کچھ صرف اندر کی انا اور خود غرضی کا کھیل ہے۔ "وہ مجھ سے آگے نکل گیا تو میری عزت میں فرق آ جائے گا؟ پھر میرا کیا مقام ہوگا؟ میں تنہا رہ جاؤں گا؟"

ارے دوستو! عشق والے تو ہوتے ہی تنہا ہیں۔ ان کے پاس تو صرف دینے کے لیے دعائیں ہوتی ہیں نہ نفرتیں، نہ بددعائیں!

اگر کوئی عشق کے نام پر نفرت پھیلاتا ہے، بددعا دیتا ہے تو سمجھ لو، وہ شیطان کا پیروکار ہے۔ پھر اس کا عشق اور روحانیت سے کیا تعلق؟

ثابت قدم رہو! اپنے آپ کو اپنے نفس سے جدا کرو۔ اُس سوچ کو مار دو جو کہتی ہے:

"میں بھی کچھ ہوں!"

جب تک تمہارے اندر "میں میں" کی صدا گونجتی رہے گی، تب تک تم شیطان کے شاگرد ہی رہو گے۔

انسان کا شاگرد بننے کے لیے پہلے انسان بننا ضروری ہے۔ یہی عشق ہے یہی صوفیاءِ کرام کی نشانی ہے، یہی اماموں کی نسبت ہے۔

سنبھل جاے انسان! صبر، اپنائیت، اور خلوص سے انسانوں سے محبت کرنا سیکھ۔

صاحبِ ارشاد

روحانی درس و تدریس کا کام اللہ تعالیٰ اُنہی لوگوں سے لیتا ہے، جو روحانی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان کے "سرٹیفکیٹ" پر مہریں ثبت ہوتی ہیں سب سے پہلے مرشد (استاد) کی، پھر حضرت علیؑ کی ولایت کی مُہر، اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ کا اجازت نامہ۔

ایسے ہی جیسے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر تمام صوفیائے کرام کو یہ اجازتیں عطا ہوئیں۔ پھر انہی میں سے بعض حضرات "صاحبِ ارشاد" کے مقام پر فائز ہو کر میدانِ عمل میں اترتے ہیں۔ ان کا کام بے لالچ، بے تعصب اور بے نفس ہوتا ہے۔

ان کی رہنمائی ہمیشہ روحانی احکامات کے ذریعے ہوتی ہے، اور یہ ایسی بات ہے جو عام انسان کی عقل اور ظاہری علم کی پہنچ سے باہر ہے۔ ان کے در پر ہر وقت خلقِ خدا کا ہجوم رہنا بھی اللہ کی عنایت ہوتی ہے۔ اب کوئی کسی مقصد کے تحت آتا ہے: کوئی سبق حاصل کرنے، کوئی روحانی سکون پانے، اور کوئی دل کی الجھنیں سلجھانے کے لیے۔ صاحبِ ارشاد وہ ہستی ہوتی ہے جسے رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تمام باریک باطنی علوم سے نوازتا ہے، مگر وہ پھر بھی خود کو "نادان" اور "لاعلم" ہی سمجھتے ہیں۔

ہر آنے والے کو اس کی روحانی سطح اور استعداد کے مطابق "کلاس روم" میں بھیجا جاتا ہے۔ مگر بعض نادان لوگ، محض بحث، سیاست یا اپنی ذہانت جتانے کی نیت سے صاحبِ ارشاد سے الجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خود کو چالاک اور عقل مند سمجھتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت، صاحبِ ارشاد اُن کی ہر چال، نیت، اور سوچ سے پہلے ہی آگاہ ہوتے ہیں۔ نتیجتاً، ایسے افراد روحانی فائدہ حاصل کرنے کے بجائے سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں، اور واپس اسی گمراہی کی راہ پر چلے جاتے ہیں جہاں رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

وہ صوفیاءِ کرام، جو اعلیٰ روحانی مقامات پر فائز ہوتے ہیں، وہ بھی عاجزی اور انکساری کی زندہ مثال بنے رہتے ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی راز کو، بغیر تصدیق، بغیر ضرورت، اور بغیر مقصد کے ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل کام خالق اور مخلوق کے درمیان روحانی تعلق کو جوڑنا ہوتا ہے نہ کہ اپنی شخصی پرستش یا واہ واہ کرانا۔

عشق، صبر اور رضا کا استعارہ

جب قافلۂ امام حسین علیہ السلام مقام قصر بنی مقاتل پر پہنچا، تو حر علیہ السلام کی قیادت میں لشکر نے امام کے قافلے کو کوفہ جانے سے روک دیا۔ اسی رات شہزادہ علی اکبر علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا اور عرض کی:

"بابا جان! میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے۔"

امام حسین علیہ السلام نے اٹھارہ سالہ جوان شہزادے کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

"کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟"

ادھر حرؑ کے پاس ابنِ زیاد کے قاصد مسلسل پہنچ رہے تھے، اور حکم یہی تھا کہ کسی صورت امام کو کوفہ نہ پہنچنے دیا جائے۔

کربلا کی مٹی، جسے صدیوں سے ان مقدس مہمانوں کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا تھا، ایک ایسی تاریخ رقم ہونے والی تھی جس پر نہ صرف زمین و آسمان، بلکہ عرشِ اعظم کے فرشتے بھی آہ و فغاں کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس میں عاشق اور معشوق کے درمیان قربت اور اس کے روحانی زاویے کو صرف ربّ العزت ہی بہتر جانتا ہے۔

رسولِ خدا ﷺ کو وقتاً فوقتاً اطلاع دی جاتی رہی کہ "حسین ہمارا ہے، اور ہم اسے ایسا مقام عطا کریں گے کہ انبیاء کرامؑ بھی رشک کریں گے۔"

اسی لیے تو کسی اور کو "جنت کا سردار" نہیں کہا گیا۔ یہ عظمت صرف حسین علیہ السلام کے گھرانے کے لیے مخصوص تھی۔

ساری زمین، پہاڑ، اور دریا کانپ رہے تھے۔ اللہ کی مخلوق انتظار میں تھی کہ کب حسینؑ ہمیں آواز دیں گے، اور ہم اپنی وفاداری کا جوہر دکھائیں گے۔

جب حضرت عباس علیہ السلام نے میان سے تلوار نکالی، تو ہزاروں جانثار جنّات ان کے ساتھ دوڑ پڑے، مگر امام حسینؑ نے فرمایا: "ہم لڑنے کے لیے نہیں، قربانی دینے کے لیے آئے ہیں۔" اگر حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی جگہ دنبہ آ سکتا ہے، تو کیا انبیاء کے سردار ﷺ کے نواسے کے بدلے میں کوئی دوسرا آ سکتا تھا؟

اگر اسماعیلؑ کی ایڑیوں کے نیچے سے زم زم کا چشمہ پھوٹ سکتا ہے، تو کیا رسولِ خدا ﷺ کے لاڈلے حسینؑ کے لیے نہرِ فرات کی یہ مجال تھی کہ پانی روک دے؟

یہ صبر کی انتہا اور رضائے الٰہی پر سرِ تسلیم خم کرنا، یہ سب حسینی ورثہ کا حصہ تھا۔

اسی لیے تو شاہ لطیف رحمتہ اللہ علیہ نے بھی کیا خوب فرمایا:

کامل کربلا ۾، آيا جنگ جوان؛
ڌرتيءَ ڌبي، لرزي، ٿرٿليا آسمان؛
ڪره هئي ڪان، هو نظارو نينهن جو.

ترجمہ:

کامل (ایمان والے) جوان کربلا کے میدان میں آئے؛
زمین دہل گئی، لرز اٹھی، آسمان ہلنے لگا؛
کیا ہی عجیب منظر تھا وہ دراصل، عشق (الٰہی) کا نظارہ تھا۔

یہ بیت صرف کربلا کے واقعے کا ایک منظر بیان نہیں کرتا، بلکہ یہ روحانی عشق، قربانی، اور کائنات کے ردِعمل کو بڑے گہرے انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس میں امام حسینؑ اور ان کے جاں نثاروں کی آمد کو ایسا روحانی لمحہ کہا گیا ہے کہ جس سے زمین و آسمان تک کانپ اٹھے۔ اور جو کچھ ہوا، وہ بظاہر جنگ تھی، مگر درحقیقت وہ عشق و محبت کی معراج تھی۔

حقیقتِ عشق

اللہ تعالیٰ کو رسولِ خدا ﷺ کے بچوں کا مقام اتنا بلند کرنا تھا، کہ بنی آدم میں کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ سے عشق کا دعویٰ نہ کرسکے۔

کربلا درحقیقت عشق اور عاشق کے درمیان ایک ایسا راز ہے، جسے آج تک کوئی مکمل طور پر نہ سمجھ سکا۔ جو سمجھنے والے تھے، انہوں نے سمجھا اور رو رو کر آنکھیں گنوا بیٹھے۔ باقی دنیا تماشا ہی دیکھتی رہی۔ کچھ نے کہا شاید انہوں نے نبی کریم ﷺ کی وہ مبارک احادیث پڑھی ہی نہیں تھیں جن میں وقتاً فوقتاً وحی کے ذریعے تحفے نازل ہوتے رہے:

کبھی کوئی لقب، کبھی کسی خواہش کی عزت، کبھی نانا جان ﷺ کی گردن پر سواری، کبھی سجدے میں سواری، کبھی سینے پر چڑھنا، کبھی اونٹ کی سواری، اور کبھی پنجتن کے ساتھ چادر میں لپٹنا۔ مکہ اور کربلا کے درمیان چھٹے مقام "بَطنِ عقیق" پر جب امام حسینؑ پہنچے تو وہاں ایک شخص ملا، جس نے امام کو آگاہ کیا کہ کوفہ میں آپ کا کوئی بھی وفادار موجود نہیں، اور کوفہ کے تمام داخلی و خارجی راستوں پر یزیدی قبضہ ہو چکا ہے۔ لیکن امام نے پھر بھی سفر جاری رکھا۔

جب آپ مقام "سَطح" (یا "سورت") پر پہنچے، تو ساتھیوں سے فرمایا کہ جتنا ممکن ہو، پانی ساتھ لے لو۔ آپ پوری حقیقت جان چکے تھے، لیکن جو ظاہری تدبیر کرنی تھی، وہ کی، اور اپنے ساتھیوں کو ہر ممکن حوصلہ دے کر اس مشکل وقت کے لیے خبردار کرتے رہے۔

لیکن رسولِ خدا ﷺ کے فرزند کی ہمت میں کمی آنا ممکن ہی نہ تھا۔

آٹھواں مقام "شَرَف" تھا، جہاں آپؑ کے قافلے میں سے ایک ساتھی نے ایک لشکر کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ امام حسینؑ نے فوراً قافلے کا رخ موڑا اور سب کو ایک پہاڑ کے پیچھے لے گئے۔

یہ دراصل راز و نیاز کے سودے ہونے والے مقام تھے، جو آج تک جاری ہیں۔ ہزاروں یزیدی سوچ رکھنے والوں کے دلوں میں حسد و بدنیتی پیدا ہوتی رہی ہے۔

ایسے ہی لوگ مال و دولت کے شوق میں، دنیا کی مختصر زندگی کے لیے راستے اور سوچیں بدل کر یزید کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور خود کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔

بہرحال، فیصلے سب ہو چکے ہیں۔ تبھی شاہ صاحب نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کریم اور رحیم ہے، وہی بہتر جانتا ہے اور وہی بہتر کرے۔

ڏنو محرّم ماہ، سنڪو شهزادن ٿيو،

ڄاڻي هيڪ الله، پاڻ وڻنديون جو ڪري۔

ترجمہ:

"محرم کا مہینہ آیا، اور پانچوں شہزادے شہید ہو گئے؛
اللہ ہی بہتر جانتا ہے، وہ جنہیں پسند کرتا ہے،
ان کے ساتھ جیسے چاہے، ویسا ہی سلوک کرتا ہے۔"

یہ شعر کربلا کے شہیدوں کی عظمت اور اللہ کی پسندیدگی کو نمایاں کرتی ہے کہ اللہ اپنے محبوب بندوں کو کیسے آزماتا ہے، اور یہ محبوب اپنی قربانی سے انسانیت کے لیے ایک عظیم مثال بن جاتے ہیں۔

صبر، راز اور بصیرت کا سفر

کربلا ایک راز ہے۔ جس نے بھی یہ راز پا لیا، وہ عشق کے دستور کے مطابق ایک قطار میں ڈھل گیا۔ "اِلستُ" کے وقت جو فیصلے ہو چکے تھے، اب صرف دنیا کی آنکھوں کے سامنے ان کا ظہور ہونا باقی تھا۔ وقت کے حکمرانوں کو ہمیشہ رسولِ اکرم ﷺ کے خاندان سے ایک خاص قسم کا خوف محسوس ہوتا تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ عوام کا ان سے عقیدت اور بے پناہ احترام تھا—اور کیوں نہ ہو؟ رسالت مآب ﷺ نے اپنی مبارک احادیث میں بارہا ان کی اہمیت واضح کی، اور اپنی امت کو ان سے محبت کا حکم دیا۔ امام حسینؑ کی موجودگی، اس دور کے ظالم حکمرانوں کے لیے کھلا چیلنج تھی۔ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی شہادتوں کے بعد بھی، حسین ابن علیؑ کی ذات تخت و تاج کو ہلا دینے کی قوت رکھتی تھی۔ تاریخ بیان کرتی ہے کہ جب امام حسینؑ کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ میں چار ہزار یزیدی فوجی احرام باندھے ہوئے حج کی شکل میں داخل ہو چکے ہیں اور ان کا مقصد مکہ کی مقدس اور پرامن سرزمین کو خون خرابے کا میدان بنانا ہے تو امام عالی مقامؑ نے حج کو عمرے میں تبدیل کیا اور اپنے اہلِ بیت کے ہمراہ مکہ سے رختِ سفر باندھا۔

جب آپؑ پہلی منزل الصفا پر پہنچے، تو وہاں مشہور عرب شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ آپؑ نے کوفہ کے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا، تو فرزدق نے جواب دیا:

"کوفہ والوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں، لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف۔"

اس نے امامؑ کو وہاں جانے سے روکنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن یہ سارا معاملہ ایک راز تھا—
صبر اور ضد کے درمیان ایک مثالی توازن، اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا نشانِ راہ، جو وفا و بے وفائی کی پہچان بنے،

زر و زیور کی چمک دمک کا حقیقت سے مقابلہ کرائے، اور خاندانِ نبوت ﷺ کے ساتھ محبت یا بغض رکھنے والوں کی اصلیت دنیا پر عیاں کر دے۔ یہ سفر ایک کسوٹی تھی جو قیامت تک

حسد، بغض، اور باطن کی سچائی کو بے نقاب کرتی رہے گی۔ شاہ صاحب (حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ) نے اس حوالے سے اپنے "سرِ کربلا" میں کیا خوب فرمایا:

سختي شهادت جي، نسوروئي ناز؛
رند پروڙين راز، قضيي ڪربلا جو

ترجمہ (اردو): شہادت کی سختی ہی اصل میں آلِ نبی کا فخر ہے؛
اور صرف باطن کے عارف ہی کربلا کے راز کو سمجھ سکتے ہیں۔

جب امامِ حسینؑ مکہ مکرمہ سے کربلا کی طرف سفر میں نویں مقام ذوالحسم پر پہنچے تو وہاں حر بن ریاحی اور اس کے تقریباً ایک ہزار سپاہیوں کا لشکر ملا—جو بہت گھمبیر حالت میں تھے۔ امامِ حسینؑ نے سب کو پانی پلایا اور ان کے جانوروں کو بھی پانی پلایا۔ اسی مقام پر ظہر کی باجماعت نماز ادا کی گئی جس کی امامت امامِ حسینؑ نے کی۔

اس مقام پر امامِ حسینؑ نے حر بن ریاحی اور اس کے سپاہیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اہلِ کوفہ نے آپ کو قاصد اور خطوط بھیج کر بلایا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے امام بن کر آئیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی راہ پر اکٹھا کریں، ہمیں ایک قیّم رہنما چاہئے جو ہمارے معاملات کو درست طریقے سے حل کرے۔ اگر آپ نے اپنی رائے بدل لی ہے، اپنی بات سے پیچھے ہٹے ہیں اور اہلِ بیت کے حقوق تسلیم نہیں کرتے، اور اپنے وعدوں کو توڑ چکے ہیں، تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ حر بن ریاحی کے لشکر نے امامِ حسینؑ کو واپس جانے نہیں دیا، بلکہ ان کو گھیر کر کربلا کی طرف لے آئے۔

اگلے دن، جب امامِ حسینؑ دسویں مقامِ بضہل (یا جو نام ہے اسی مقام پر) پہنچے، تو امامِ حسینؑ نے حر کے لشکر سے فرمایا کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص ایسے ظالم حاکم کو دیکھے جو اللہ کے حرام کو حلال سمجھتا ہو، اللہ کے عہد و پیمان توڑے، سنتِ رسول ﷺ سے منہ موڑے اور بندوں پر ظلم کرے تاکہ اپنی سلطنت قائم رکھ سکے—ایسے شخص کی جگہ جہنم ہے، کیونکہ اس کی گفتار اور کردار میں تضاد ہے۔ امامِ حسینؑ نے اس مقام پر اپنی نصیحت کو

دہراتے ہوئے کہا کہ تم نے بیعت (وفاداری کا عہد) کیا تھا، لیکن اس کا اثر فوج حر پر خاص طور پر نہیں ہوا۔ حر نے سخت لہجے میں کہا کہ اگر آپ ہماری بات نہ مانیں تو آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ بعد ازاں مقام عزیب الحجنات پر امامِ حسینؑ کی ملاقات طِرِمّاح بن عَدی سے ہوئی، جس نے عرض کیا کہ کوفہ والوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ امامؑ سب کچھ جانتے تھے اور جواب دیا کہ ہمارے اور ہمارے ساتھ والوں کے عہد و پیمان ٹوٹے نہیں جا سکتے۔ طرماح نے امامؑ کو مشورہ دیا کہ وہ کسی محفوظ جگہ پناہ لے لیں، لیکن امامؑ نے کہا کہ اللہ آپ اور آپ کی قوم کو جزا دے۔

وقت کے ساتھ حر بن ریاحی کی طبیعت میں تبدیلی محسوس ہونے لگی؛ امامِ حسینؑ کی صحبت کے اثرات حر پر ظاہر ہونے لگے۔ ربِ کائنات جب کسی کی قسمت بدلتا ہے تو وہ بدلتا ہے آج بھی حر بن ریاحی کی شہادت و وفا کا نام روشن ہے۔ جہاں اہلِ بیتِ حسینیؑ کی نسل موجود ہے لوگ حر کی دلیری اور اہلِ بیت کے ساتھ وفا پر فخر کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس حوالہ سے خوب کہا ہے:

هئي هدايت حر کي، ازل ۾ اصلا؛
چڙهي آيو جنگ تي، هلي هن پارا؛
ايندي چيائين امام کي: گهوريس آن مٿاءِ؛
لا يَكلِفُ الله نفسًا إلا وسعها، جيڪا پڄنديم سا؛
گهوٽ ٻه لڳا گهاءِ، سر پڙ شير شَهيد ٿيو۔

ترجمہ: حر جنگ کے ارادے سے آیا، مگر پھر حق کے راستے پر آ گیا؛ وہ آ کر امامؑ سے عرض گزار ہوا: 'مولیٰ، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: 'اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا'؛ میں اپنی سمجھ کی جس حد تک پہنچ سکا، وہاں تک پہنچ گیا؛ آخرکار، وہ محبوب بھی زخم کھا کر، شیر کی طرح سر دے کر شہید ہو گیا۔"

(شاہ صاحب کے اس شعر کا مفہوم: حر کی ہدایت ازل سے مقدر تھی؛ وہ میدانِ جنگ میں آیا، امام نے اسے دیکھ کر کہیں اور بھیجا؛ اور پھر حر نے کہا الفاظِ حکمت والی باتیں "اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا" اور آخر میں شیر کی مانند شہید ہوا۔)

مقامِ علی علیہ السلام

جب بھی رمضان کی اکیسویں تاریخ آتی ہے تو ایک منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے: مسجدِ کوفہ کا وہ عالم، اور امیر المؤمنین پر ضرب لگنا۔ ایک سازش، ایک مداخلت، جس کے نتیجے میں شیر خدا، فاتحِ خیبر کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

بے شک امرِ الٰہی کے سامنے خاموشی، یقین، تسلیم اور رضا لازم تھی، لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی علی علیہ السلام کا نام امن، امان اور صلح کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

محبوبِ کریم ﷺ نے علی علیہ السلام کے چہرے اور نام کو بغض و حسد کی پہچان نہیں بلکہ ایمان کی علامت قرار دیا۔ آپ کا کردار، اخلاق، اور اقوالِ زریں رہتی دنیا تک صبر، حلم اور عدل و انصاف کا بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ افہام و تفہیم کی مثال تھے، اور آج بھی آپ کا پیغام وفا و حق کی نشاندہی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپ کبھی بھی ذاتی دشمنی یا نفرت کے لیے سرگرم نہ رہے، بلکہ ہمیشہ ایک نظریے، ایک مشن، اور ایک اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی قوت صرف کی۔ چاہے وہ وقت ہو جب امانتیں سونپی گئیں، اور آپ نے اپنے سردار و رہبر کے حکم کے تحت ان کی جگہ اور چادر استعمال کی تاکہ تلواروں کی گونج میں بھی امانتوں میں خیانت نہ ہو، اور وہ امانتیں اپنے مالکوں تک واپس پہنچیں۔

یہی فلسفہ اسلام ہے خیانت کسی بھی صورت میں ناقابلِ قبول ہے۔ آپ نے کم عمری میں، بیس برس کی عمر میں، جنگِ بدر میں پرچمِ اسلام اٹھایا۔ یہ اعتماد کی وہ بڑی نشانی تھی جو سردارِ الانبیاء ﷺ نے آپ پر کیا۔ علی علیہ السلام نے اٹھتیس قبائل کے سرداروں کو جہنم واصل کیا، اور وہیں سے ان سرداروں اور ان کی نسلوں میں علی علیہ السلام اور آپ کی نسل کے خلاف سازش اور حسد نے جنم لیا۔ یہ دشمنی شاید قیامت تک نظریاتی طور پر جاری رہے — مگر علی علیہ السلام نے اسے ذاتی عناد نہیں بنایا، بلکہ حق و سچ کے نظریے کے تحت، اپنے سردار کی اطاعت کرتے ہوئے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔

یہی علی علیہ السلام جنگِ اُحد میں وہ شخصیت تھے جنہوں نے آٹھ بار پرچم اٹھایا، اور قبائل کے رہنماؤں کو جہنم واصل کیا۔ یہی عمل ان کرداروں کو کھلنے لگا جو حق والے اسلام کو برداشت نہ کرسکے۔ مگر وہ روشن چراغ تو طلوع ہو چکا تھا ——اور قیامت تک چمکنا تھا۔ آپ ﷺ نے خیبر میں بھی علی علیہ السلام کے ہاتھوں فتح کا اعلان فرمایا۔ اور حجۃ الوداع کے موقع پر، آخری خطبے کے بعد، جب آپ ﷺ نے علی علیہ السلام کا ہاتھ بلند کرکے فرمایا:

"من کنت مولاہ فھٰذا علیؑ مولاہ"

(جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہے)

یہ اعلان دراصل حق اور قیادت کا اعلان تھا۔ علی علیہ السلام، تمام خلفاء کے دَور میں قاضیٔ اعلیٰ (سپریم جج) کے منصب پر فائز رہے۔ ہمیشہ مکمل تعاون کے ساتھ اسلام کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے۔ آپ نے کبھی بھی بغض، عداوت اور نفرتوں کو ہوا نہیں دی، بلکہ صبر اور استقامت سے محبوبِ کریم ﷺ کے پیغامِ امن کو پھیلانے میں مصروف رہے۔

حتیٰ کہ شہادت کے وقت بھی، اپنے قاتل کو پانی پلا کر، انسانیت کو درگزر کی ایک ایسی مثال دے گئے، جس پر اگر آج بھی دنیا غور کرے، تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

تبھی تو شاہ صاحب نے کہا:

"گذر گئي گذران، ڪين قبولج ڪاپڙي،
علي جو مڪان، سڪون سنياسن کي"

(زندگی گزارنے کی جگہ ہے، لیکن جھوٹ کو قبول کرنا علیؑ کا مقام نہیں۔ علیؑ کا مقام تو ان سنیاسیوں کے سکون جیسا ہے جو حق کے راستے پر ثابت قدم ہوتے ہیں۔)

زندگی تو ایک سفر ہے، مگر علی علیہ السلام کا فلسفہ کبھی بھی جھوٹ، نفاق اور خیانت کو قبول نہیں کرتا۔ آپ نے ہمیشہ سچ کے سنیاسی، سچ کے راستے کے محافظ بن کر دنیا کو صبر، عدل، اور وفا کا سبق دیا۔

مسلک عشق

ہمارا مسلک اہلِ عشق والوں کی صحبت سے وابستہ ہے۔ ہمارا نام و نشان گم شدہ ہے۔ ہم ان کی تلاش میں راہِ سفر پر نکلے ہوئے وہ لوگ ہیں، جو مسلسل ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جہاں بھی محبت کا خزانہ چھپا ہوا ملتا ہے، ہم وہاں جا کر ان کے پاس بیٹھتے ہیں، ان کی خاک کو سونگھتے ہیں، اور پھر پہچاننے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

ہمارا کاروبار بھی کچھ ایسا ہی ہے جسے نہ زمینی آفات نقصان پہنچا سکتی ہیں، نہ آسمانی۔ ہم اُن بغض اور محبت کے بیچ کے مسافر ہیں، جن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"دو گروہ جہنم میں جائیں گے: ایک میری محبت میں حد سے بڑھ جانے والا، اور دوسرا میرے بغض میں مرنے والا۔"

ہم معاشرے میں بحث اور تکرار کرنے والوں سے دور نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ بغیر کسی جھگڑے اور ضد کے، سکون سے اپنی راہ پر چل سکیں۔

ہمارا عقیدہ ایک اللہ کی عبادت کرنا ہے، جس کا نہ کوئی شریک ہے نہ نظیر۔ اور ہم اُس کے محبوب، حضرت محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ان پر درودِ پاک پڑھتے ہیں، جیسا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ ہماری دعائیں سب کے لیے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی بڑا اعترافی دشمن یا حسد کرنے والا کیوں نہ ہو، کیونکہ ہمارے رہبرِ کریم ﷺ تو "رحمتٌ للعالمین" ہیں۔ ہم انہی کی پیروی کرتے ہیں۔

ہمیں صبر اور شکر سکھایا گیا ہے، اسی لیے ہم جذباتی لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں علم "حضری دروازے" سے ملتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے ایسی ہی تربیت اور خاص صحبت درکار ہوتی ہے۔

ہمارا رہن سہن بھی کچھ ایسا ہی ہے، جسے ہر ایک نہ دیکھ سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے۔ ہم تجارتی لوگ ہیں، ایسی تجارت کرتے ہیں جس میں نقصان کم اور فائدہ بقا (یعنی ہمیشہ باقی رہنے والا) ہوتا ہے۔

بابِ اخلاقیات اور عبادات

فقیری کا راستہ

دوستو! ہر طرف افراتفری کا عالم ہے۔ ہر شخص اس دور میں آگے نکلنے کی دوڑ میں اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اب خاموشی سے واپس لوٹنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ دنیا کی لالچ، اقتدار کی بھوک، شاہانہ شوق، ہیرا پھیری اور ٹھگی والے جگاڑ، ان دیکھے فیصلے، تمناؤں اور خواہشوں کی لمبی فہرستیں، مستقبل کی منصوبہ بندی، ان سب میں مشغول رہنے کی وجہ سے زندگی میں قیمتی لمحات ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔

اب اگر زمانے میں دوستیاں اور رشتے رکھو تو وہ بھی جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وَيٺي جِنِين وَٽُ،
ڏُکَندو ڏُور ٿِئي؛
تَنَ! تِنِين سين گَٿِ،
اوڏا آڏي پَکَڙا۔

(شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے پاس بیٹھنے سے تمہارے دکھ درد ختم ہوں ان لوگوں کے قریب جا کر بیٹھو۔)

اس لیے اب ہمیں ان کی طرف جانا چاہیے جہاں سے سکون کا درس ملے، جہاں چند گھڑیاں سکون اور آرام کی نصیب ہوں۔ یہاں تو ہر کوئی اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے، دوسروں کے لیے سوچنا مشکل ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشورہ کس سے لیا جائے؟

دوستو! ہر زمانے میں اللہ کے نیک و صالح بندے ضرور موجود ہوتے ہیں، جو حضرت خضر علیہ السلام کے شاگردوں کی طرح اپنے ذاتی مفاد سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات کسی ذاتِ برتر کے حوالے کر چکے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف اصلاح اور اچھا مشورہ دینا ہوتا ہے، ایسا مشورہ جو ہر گز تعلیماتِ محمدی ﷺ سے دور نہ کرے۔

وہ بیگانوں اور بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانے کے لیے آگ پر پانی ڈالنے کا کام کرتے ہیں۔ وہ کامل نگاہ سے ایسی محبت بانٹتے ہیں کہ دل ٹھنڈا ہو جائے، غموں کا بوجھ ہلکا محسوس ہو، اور زندگی دوبارہ جینے کا جنون پیدا ہو۔ مایوسی اور نامرادی کا اختتام ہو۔

دوستو! سچ یہ ہے کہ وہی فقیری کا راستہ ہے۔ اور فقیری کا پہلا اور آخری درس درودِ پاک کی کثرت ہے۔ آئیں! اس ورد کو کما کر اپنا پکا سرمایہ بنائیں۔

دوستی

دوستو! زندگی اور دنیا کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ عجیب الجھنیں ہیں، جو وقت کے ساتھ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دستورِ فطرت ہمیشہ رواں دواں ہے۔ دنیا میں جو بھی پیدا ہوا، وہ سب کو پسند نہیں آسکتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی پسند اور ناپسند ہے۔ اسی طرح دوستیاں اور دشمنیاں بھی مختلف ہیں، ان کی حدود اور دائرۂ کار بھی الگ الگ ہیں۔

صوفیاءِ کرام کی دوستی اور دشمنی کا انداز بھی نرالا ہے۔ صوفی کی دشمنی اپنے آپ سے، یعنی اپنی خواہشات سے ہے۔ وہ رات دن اس دشمنی کو قائم رکھنے کی کوشش میں مگن رہتا ہے۔ خواہشات کے جوابی حملوں سے بچنے کے لیے وہ مختلف حربے استعمال کرتا ہے تاکہ محفوظ رہے، اور موقع ملتے ہی ان پر وار کرتا رہتا ہے۔ یوں زندگی کے اختتام تک یہ جنگ جاری رہتی ہے۔

اس اندرونی تنازعے میں صوفی ایک بھائی بناتا ہے۔ اس بھائی سے وہ وقتاً فوقتاً حملوں سے بچنے اور ان کے خلاف جوابی وار کرنے کا علم اور فن سیکھتا ہے۔ اس بھائی کو صوفیانہ زبان میں استاد، رہبر اور مرشد کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ صوفی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کی صحبت میں رہے۔ لیکن کبھی کبھار زمانے کی

گردشوں میں گم ہو جاتا ہے، تو عجیب کیفیات سے گزرتا ہے۔ پھر چونک کر گہرے سانس لیتے ہوئے پکارتا ہے:

"میرے دوست! مجھ پر ایسا ہاتھ رکھو، کوئی ایسی ضرب لگاؤ کہ میرا قلب سکون پا جائے۔ میں روز روز کی اس لڑائی سے تھک گیا ہوں۔ میرا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی بلند آواز میں صدا نکل جاتی ہے تو لوگ مجھ پر ہنستے ہیں۔ میں مجبور ہوں، اور کسی کو بتا بھی نہیں سکتا۔ مجھ میں صبر کی کمی ہے۔ میں کس کو بتاؤں کہ میرے استاد نے مجھے ایک ایسی لڑائی میں ڈال دیا ہے، جہاں ایک طرف دنیاوی خواہشات ہیں اور دوسری طرف محبوب کی محبت نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔"

یہ محبت ایک ایسی تصویر اور ایک ایسی تسبیح کے ذریعے اسے اس آقا سے ملا دیتی ہے، جو اسے سونے نہیں دیتا۔ دنیا میں رہ کر بھی وہ اللہ کی طرف کھنچتا رہتا ہے۔ کبھی تہجد کی صورت میں، کبھی فرائض کی ادائیگی میں، کبھی خدمتِ انسانیت کی صورت میں، اور کبھی تعلیماتِ محمدی ﷺ پر عمل کرنے کی جستجو میں۔

عجب جہاد کی زندگی ہے؛ میں چپ بھی نہیں رہ سکتا، اور بولوں تو کیا بولوں؟ مجھے کس نے اپنی اداؤں سے ایسا کر دیا ہے کہ میں اس کا ہو گیا ہوں جس کا سارا جہان ہے؟

آئیں! اُس رحمت للعالمین ﷺ پر درودِ پاک کی کثرت کریں۔

آخرت

ماشاءاللہ ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔ دنیااور آخرت کی تمام نعمتیں درودِ پاک کی شکل میں ایک کوزے میں بند کرکے امتِ مسلمہ کو عطا کر دی ہیں۔

اے اکیسویں صدی کے انسان ! ذرا غور کر... سارے غم اور فکریں ایک طرف رکھ دے اور درودِ پاک کی محفل میں گم ہو جا۔ گھونٹ گھونٹ کرکے اسے پی جا، گلے سے اتار لے، دل میں چھپالے۔ اے انسان ! تیری قسمت کو میرا سلام ہے کہ تُو نے یہ فیصلہ کرلیا، یہ حقیقت تسلیم کرلی۔

یاد رکھ ! ابھی تیرے نصیب بدلنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ بس ذرا ٹھہر جا۔ غرور کو دل سے نکال دے، خودی کو بیچ کر عاجزی خرید لے۔ صبر اور شکر کے ساتھ، سکون اور استقامت کے ساتھ، مکمل پابندی کے ساتھ درودِ پاک کی راہ پر لگ جا۔

پھر دیکھ ! سب راہیں ایک سمت میں مل جائیں گی، اور وہ سمت ہے محبوب ﷺ کا محبوب راستہ، یعنی درودِ پاک۔

الحمدللہ !

فکرِ زمانہ

دوستو ! زندگی کے کئی رخ اور کئی نمونے ہیں— کبھی بچپن، کبھی جوانی اور کبھی بڑھاپا۔ مگر یہ سب مرحلے ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتے۔ کوئی بچپن دیکھتا ہے مگر جوانی تک نہیں پہنچ پاتا، کسی کو جوانی ملتی ہے مگر بڑھاپا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ سب تقدیر کے راز ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

بچپن بھی سب کو یکساں نہیں ملتا۔ کوئی یتیم ہوتا ہے، تو کسی کے والدین اپنی مصروفیات یا دوسری شادیوں کی وجہ سے اپنی اولاد کو وقت نہیں دے پاتے۔ کوئی بچوں کو دائیوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ کہیں والدین اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتے ہیں۔ یہ سب معاشرتی حقیقتیں ہیں جو ہم روز دیکھتے ہیں۔

پھر جوانی کا مرحلہ آتا ہے۔ کچھ خاندان اپنی اولاد کو اخلاقیات سے دور رکھ کر صرف اسٹیٹس اور تعلقات کا سبق دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی میں بچے برائیوں میں پڑ جاتے ہیں، نہ حلال حرام کی تمیز سیکھتے ہیں اور نہ دین کی روشنی۔ دوسری طرف مڈل کلاس کے لوگ ہیں، جو انہی دولت مند خاندانوں کے انداز اپنانے کی دوڑ میں لگ جاتے ہیں۔ کوئی تعلیم اور نوکری کے ذریعے اسٹیٹس حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی سیاسی وابستگیوں سے، اور کوئی دھوکہ دہی کے ذریعے۔ مگر بڑھاپے میں پہنچ کر سب کو پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے— ساتھ ٹینشن اور بیماریوں کی طویل فہرست بھی۔

ہمارے معاشرے میں ایک مزدور طبقہ بھی ہے، جس کے جوان اپنی زندگیاں اپنے خاندان کے پیٹ پالنے میں لگا دیتے ہیں۔ بہن بھائیوں کی خوشیوں اور خواہشات کے لیے اپنی جوانیاں قربان کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ جوان برے

دوستوں کی صحبت میں آ کر منشیات، چوری اور برائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور بڑھاپے میں سوچتے ہیں... مگر تب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

دوستو! میری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان چاہے کسی بھی طبقے سے ہو، اسے اپنی جوانی اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر گزارنی چاہیے۔ جیسا کہ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

وقتِ پیری گرگِ ظالم می شود پرہیزگار

(جوانی میں توبہ کرنا انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے، ورنہ بڑھاپے میں تو ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے۔)

جوانی ایک عظیم نعمت ہے۔ اسی میں انسان سنبھلتا بھی ہے اور پھسل بھی سکتا ہے۔ توبہ کا مطلب ہے کہ اپنی نادانیوں کو چھوڑ دو اور نیک راستے کو اختیار کر لو۔ اگر اللہ کے کرم سے تمہیں کوئی رہنما مل جائے جو صحیح راستہ دکھائے، تو اس کی بات کو غنیمت سمجھو اور اس پر عمل کرو۔ اس کا فائدہ تمہیں بھی ہوگا، تمہاری نسلوں کو بھی اور پورے معاشرے کو بھی۔

یاد رکھو! ندامت اور توبہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کا راستہ ہے۔ جوانیاں ختم کر کے بڑھاپے میں آ کر بھوکا شیر بننے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ خود شکار ہو جاتا ہے... اور موت تو ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دیتی۔

آؤ میرے بچو! اپنی جوانی کو ضائع نہ کرو۔ اسے کیش کرواؤ! سب بدکاریوں سے بچو، سب بدمعاشیاں ترک کرو۔ اس نعمتِ جوانی کو رحمت سمجھ کر درودِ پاک کی کثرت میں لگا دو۔ درود پڑھو، درود پڑھاؤ، اور اس مبارک عمل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لو۔

نصیحت

دوستو! ایک کہاوت ہے کہ بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ شاید یہ بات سچ بھی ہے۔ انسان بھی اپنی طاقت، رعب اور دبدبہ دوسروں پر جتاتا ہے، پھر اسی پر خوش ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہے، بڑا ہے۔ لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ بڑا تو کوئی اور ہے۔ وہ جو حیّ و قیوم ہے۔ باقی سب فنا کے زمرے میں آتے ہیں۔

یہ دنیا اور اس کی عیش و عشرت محض وقتی ہے۔ سب کچھ فنا ہو جانا ہے۔ اصل میں انسان صرف وقتی طور پر اپنے آپ کو بہلاتا ہے۔ لیکن جو لوگ سمجھدار ہیں، جو اہلِ بصیرت ہیں، یعنی صوفیاء کرام، وہ ان باتوں کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی نصیحت کرتے ہیں۔

صوفیاء کی مثال ایک بڑے پرندے کی طرح ہے۔ سوچو! جب ایک پرندہ آرام سے کیڑے مکوڑے (یعنی نفس کی شیطانی حرکتیں) پکڑ کر کھا سکتا ہے تو پھر کیوں وہ اپنی ہی نسل کے دوسرے پرندوں پر حملہ کرے؟ کیوں ان کی خوشیاں اور تمنائیں چھینے؟ اگر وہ دوسروں کو ڈراتا ہے، ان پر ظلم کرتا ہے، تو کل وہ خود بھی شکار ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جب عمر کے ساتھ تمہارے پر اُڑنے کے قابل نہ رہیں گے تو پھر تم بھی کسی خونخوار جانور یعنی موت کا شکار ہو جاؤ گے۔ ڈرو اس دن سے!

اپنے اندر ٹھہراؤ لے آؤ۔ اپنی جسامت اور اپنی زندگی پر اُس خالق کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں بہترین صورت میں پیدا کیا۔ دوسروں پر رحم کرو، تاکہ تم پر بھی رحم کیا جائے۔

منافق

دوستو! منافق ایک ایسا بے موسمی مینڈک ہے جو ہر موسم میں پایا جاتا ہے۔ جہاں بھی ہو، کسی نہ کسی طرح اپنی موجودگی ظاہر ضرور کرتا ہے۔ اس کے اندر کچھ عجیب و غریب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

اس کی سب سے بڑی مہارت یہ ہے کہ وہ ہر موسم کے مطابق چہرہ بدلنے میں کمال رکھتا ہے۔ یہ ہتھیار وہ جہاں چاہے اور جب چاہے وہ استعمال کرتا رہتا ہے۔ اس کی بے ربط اور شور شرابے والی آوازیں ماحول کو وقتی طور پر چونکا دیتی ہیں۔ کبھی یہ آگے بڑھ کر سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹ کر موقع دیکھتا ہے۔ وقت مقرر پر اچانک چھپ جانا اور پھر نمودار ہو جانا بھی اس کی پہچان ہے۔

منافق کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ جہاں اسے ذرا بھی موقع مل جائے، وہ نہ کسی کے نفع کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی نقصان کی۔ وہ بس اپنی فطرت اور عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر فوراً اپنا مطلب نکالنے لگتا ہے۔ جیسے ایک اسکرو (پیچ) کسی بھی سوراخ میں فوراً فٹ ہو جاتا ہے، ایسے ہی وہ ہر موقع پر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

لیکن دوستو! ایسے افراد سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صبر کو اپنا ساتھی بناؤ۔ صبر ہی تمہیں ان بے موسمی مینڈکوں کی پہچان بھی کروائے گا اور تمہیں ان کے شر سے محفوظ بھی رکھے گا۔

ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوداگری

دوستو! مارکیٹ میں بے شمار اجناس لائی جاتی ہیں۔ ہر جنس اپنی جسامت، اپنی کوالٹی اور اپنی اصل کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہے۔ ایک ماہر خریدار فوراً پہچان لیتا ہے کہ کون سی چیز اصلی ہے اور کون سی نقلی، کون سا سودا فائدے کا ہے اور کون سا گھاٹے کا۔ لیکن اگر خریدار اناڑی ہو، ناتجربہ کار ہو، تو وہ اکثر دھوکے میں آ کر غلط سودا کر بیٹھتا ہے، اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

اسی طرح دوستو! یہ دنیا بھی ایک بڑی مارکیٹ ہے۔ یہاں ہر قسم کی جنس دستیاب ہے۔ کوئی چیز اصلی ہے، کوئی نقلی۔ کوئی نئی ہے، کوئی پرانی۔ کوئی وقتی ہے، کوئی ہمیشہ رہنے والی۔ اب یہ تمہارے ایمان اور عقل پر ہے کہ تم کون سا سودا کرتے ہو۔ کیا تم وقتی لذتوں اور دھوکے کی چیزوں پر جان دیتے ہو یا ہمیشہ رہنے والی، قیمتی اور اصل چیز خریدتے ہو؟
یاد رکھو! اس بازارِ دنیا میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان اپنی ایمان کی دولت کسی سستی، وقتی اور دھوکے والی جنس کے بدلے بیچ ڈالے۔ اور سب سے بڑا منافع یہ ہے کہ انسان اپنے ایمان، نیک اعمال اور درود و ذکر کی شکل میں وہ چیز خرید لے جو ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والی ہے۔ لہٰذا دوستو! جب بھی سودا کرو، تو اکیلے مت کرو۔ ہمیشہ کسی ماہر، کسی رہبر، کسی رہنمائے سچے کا سہارا لو۔ یہی عقلمندی ہے۔ ورنہ دنیا کے اس بازار میں دھوکہ بازوں کے ہاتھوں لوٹ لیے جاؤ گے۔

دوستو! دیکھو، جنہوں نے اس دنیا کے بازار میں صرف وقتی اشیاء خریدیں، بس وقت گزارنے کے لئے، آج ان کی قبریں ویران پڑی ہیں۔ نہ ان کا نام باقی ہے، نہ کوئی ان کی یاد میں چراغ جلاتا ہے۔ لیکن جنہوں نے اصل اور نایاب چیزیں خریدیں، وہ قیمتی گوہر جو دھوکے بازوں کے گودام سے نہیں بلکہ سچائی اور ایمان کے سوداگر کے پاس سے ملتی ہیں، آج ان کی قبریں آباد ہیں۔ ان کی دعائیں، ان کی فکر، ان کا فلسفہ آج بھی زندہ ہے، اور لوگ ان کو یاد کرکے اپنی راہیں متعین کرتے ہیں۔
بس دوستو! سوچو، نقل سے بچو، اصل کو خریدو۔ وقتی چمک دمک کے پیچھے نہ بھاگو، بلکہ اس دنیا میں وہ سودا کر لو جو قبر کو بھی آباد کرے اور آخرت کو بھی۔

دنیاوی خواہشات

دوستو! دنیا کی تاریخ، بنی آدم کی پیدائش سے لے کر فلاسفروں کے فلسفے تک اور مذاہب کی روشنی میں، مجھے جو بات سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان سے بڑا انسان کا کوئی دشمن نہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو انسان خود اپنی زندگی کا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ کیونکہ وہ اپنی خواہشات کو اتنا وسیع کر لیتا ہے کہ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی صحت سمیت سب کچھ ختم کر دیتا ہے۔ اسے خیال تب آتا ہے جب سارا کھیل ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے مفادات کی خاطر اپنوں اور غیروں کے ساتھ جھوٹ بول کر اور مخفی طور پر چوریاں کرکے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے دنیا کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا ہے۔ لیکن غرور، تکبر، شیطانی حرکات اور منافقانہ ہتھکنڈے اس کی ساری خوشیاں تباہ کر دیتے ہیں۔

پھر اسے یہ احساس ہونا شروع ہوتا ہے کہ جس زندگی کو میں نے بقا سمجھ کر اپنی اور اپنے بچوں کی صحت سمیت سب کچھ داؤ پر لگا کر خریدا تھا، کیا واقعی میں نے اس زندگی کو اپنی مٹھی میں کر لیا ہے؟ مگر وہ اس حقیقت پر آ کر ٹھہر جاتا ہے کہ ایک مٹھی بھر مٹی بھی میری نہیں ہے، وہ بھی کوئی اور مجھ پر ڈالے گا، اور میرا اس پر بھی بس نہیں چلے گا۔ ذرا سوچو! ترقی ضرور تلاش کرو، دولت، اقتدار، کوٹھیاں، سواریاں، یہ سب اللہ پاک کی نعمتیں ہیں۔ لیکن دوسروں سمیت اپنے آپ کو دھوکا دے کر دل خوش نہ کرو۔ ان چیزوں کو عارضی سمجھو۔ پھر نعمتیں بھی قائم رہیں گی اور نعمت دینے والا بھی راضی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا راستہ تلاش کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

اس طرح انسانی تاریخ میں کچھ ایسی شفیق شخصیات بھی آئی ہیں جنہوں نے اپنی الہامی تعلیمات کے ذریعے انسان کی زندگی کو نکھارنے اور کامل بنانے کے لیے بڑے بڑے دکھ برداشت کیے، اور یہ دکھ بھی ان کو انسانوں ہی سے ملے۔ ان ہستیوں میں سب سے اعلیٰ و برتر ہمارے سردار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ان کے تربیت یافتہ اصحابِ کرامؓ، خاندانِ رسولؐ اور ان کے بعد آنے والے صوفیاءِ کرامؒ بھی شامل ہیں جنہوں نے انسانیت کی بہتری کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

فضل و کرم

دوستو! یہ دنیا رنگینیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بے شمار پرکشش چیزیں ہیں جن میں انسان پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ کوئی ان سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، تو کوئی انہیں پانے کی خواہش میں لگا رہتا ہے۔ کوئی جستجو کے باوجود بھی نہ پا سکا، کوئی پا کر بھی سنبھال نہ سکا، اور کوئی آج بھی انہیں محفوظ کرنے کے چکر میں مصروف ہے۔ مگر یاد رکھو! یہ سب کھیل وقتی ہے۔

زمین پر چلنے والے پرندے سوچتے ہیں کہ کاش ہمارے بھی پر ہوتے تاکہ ہم شہباز کی طرح بلندیوں پر پرواز کر سکتے، لیکن ہزار کوششوں کے باوجود وہ اڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح اڑنے والے پرندے چاہتے ہیں کہ کاش ہم پانی میں تیرنے والے پرندوں کی طرح تیر سکیں، مگر وہ تیر نہیں سکتے۔ بعض پرندے ایسے ہیں جو اڑ بھی سکتے ہیں، تیر بھی سکتے ہیں اور زمین پر چل بھی سکتے ہیں۔ یہ سب خوبیاں انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔

یہ کائنات عجیب حکمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ کچھ مخلوقات کو صرف ایک صلاحیت دی گئی ہے، کچھ کو دو، اور کچھ کو تین۔ لیکن جب کسی کو تین عظیم نعمتیں عطا کر دی جائیں، تو وہ صوفیاء کرام کی ان ہستیوں میں شمار ہوتا ہے جو علم، عقل اور عشق تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، مگر غرور نہیں کرتے۔

لیکن جنہیں صرف ایک ہی نعمت عطا کی گئی ہو، وہ اس پر کبھی حیرت کرتے ہیں اور کبھی حسد۔ مگر افسوس! یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ سب اسی کی تقسیم ہے۔ وہ جو چاہے اور جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔

صحبتِ فقیر

دوستو! فقیروں کے قلب پر محبت کے نشان ہوتے ہیں۔ جو اہلِ نظر ہوتے ہیں، وہ ان نشانات کو دور سے ہی پہچان لیتے ہیں۔

یہ عشق کے وہ سنیاسی لوگ ہیں جن کے ناک، کان اور دل سب اس طرف متوجہ ہو چکے ہیں، جہاں محبوب کے دیدار کے محل بنے ہوئے ہیں۔

وہ وہاں جا کر اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہیں، اور اپنے دلوں کے چراغوں کو عشق کی روشنی سے منور کرتے رہتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ دنیا کی نظروں میں وہ مستانے، دیوانے اور بے فائدہ لوگ سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن جب دنیا والوں کے کام پھنستے ہیں، تو انہی کی چوکھٹوں سے انہیں دستارِ امیری نصیب ہوتی ہے۔

یہی فقراء وہ لوگ ہیں جو دنیاوی لوگوں میں اللہ کی دی ہوئی نعمتیں بانٹتے ہیں۔ وہ دلوں کے مرہم ہیں، جو اپنے دل کی حسرتیں قربان کرکے انسانیت کی حسرتیں پوری کرنے میں مگن رہتے ہیں۔

ان کے آستانوں پر بڑی رونقیں ہوتی ہیں وہاں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔ سب ایک صف میں کھڑے، ایک ہی نور کے مسافر ہوتے ہیں۔

جس نے بھی ایک بار ایسے تکیے (آستانے) دیکھ لیے، وہ لازمی ان کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

اِن شاء اللہ تعالیٰ!

معاشرتی ٹھنڈک

دوستو! یہ ایک قدرتی سی بات ہے کہ اگر انسان ایسی ناندی (پانی کا گھڑا) بن جائے، جو گرمی میں مسافروں کے لیے فی سبیل اللہ ٹھنڈا پانی فراہم کرے، تو یقیناً معاشرے کی تپش اور دکھوں سے جلے ہوئے لوگ اپنی پیاس بجھانے کے لیے ایسی ناندیوں کے پاس ضرور آئیں گے۔

ناندیوں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ آج جب لوگ صوفیاءِ کرام کے مزارات، اُن کی تعلیمات اور طریقہ کار پر سوال کرتے ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ شخصیات دراصل ایسی "ٹھنڈی ندیاں" تھیں، جو اپنے معاشرے کے پیاسے، الجھے، اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو خوب جان کر، سمجھ کر انہیں راہِ حق کی طرف بلاتی تھیں۔ وہ ان کو معاشرتی تباہی اور ذہنی خودکشی سے روکتی تھیں۔

وہ حقیقتوں کو بیان کرکے لوگوں کو یہ سکھاتی تھیں کہ وقت تو گزر جاتا ہے، لیکن فکر اور فلسفہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس طرح لوگ جہالت، بناوٹی دنیا، اور کھوکھلے تصورات سے دور ہونے کا سلیقہ سیکھ لیتے تھے—اور یہ راستہ انہیں اپنے استاد، اپنے مرشد کی تعلیمات سے ملتا تھا۔

ایسی بزرگ شخصیات جب اپنے مرشد کے وصال کے بعد جانشینی کے جھمیلوں میں نہیں پڑتیں، بلکہ خالصتاً اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کے لیے جیتی ہیں، تو وہی لوگ دنیا میں واقعی مقبول و محترم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے لوگوں کو نوازتے ہیں بغیر کسی دنیاوی لالچ، شہرت یا اختیار کے۔

اسی لیے آج بھی دنیا انہیں عزت اور عقیدت سے یاد کرتی ہے۔ چاہے وہ لال شہباز قلندرؒ ہوں، غوث بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، داتا علی ہجویریؒ یا خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ان جیسے عظیم لوگ وقت کے ساتھ آتے رہے ہیں، اور قیامت تک آتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ کبھی رکے گا نہیں۔ یہ ندیاں کبھی خشک نہیں ہوں گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ... کیا آج کے زمانے میں کچھ ندیاں صرف "گھریلو مشینیں" اور "فرج" بن کر رہ گئی ہیں؟ کیا وہ صرف اپنے خاندان اور مفادات تک محدود ہو گئی ہیں؟ کیا وہ "فی گلاس پانی" کے پچاس روپے لینے لگی ہیں؟ کیا وہ خود کو جعلی قطب، ولی، یا پیر مشہور کر رہی ہیں؟

اگر ایسا محسوس ہو، تو یاد رکھنا کہ یہ اُن بزرگ ہستیوں کا قصور نہیں۔ وہ تو ہمیشہ وحدانیت اور رسالت کے قائل رہے۔ انہوں نے کبھی عاجزی نہ چھوڑی، نہ اپنے آپ کو "خدا" کہلوایا۔ انہوں نے تو ہمیشہ بندوں کو خدائے واحد کے راستے پر چلایا اپنے عمل، علم اور تعلیمات کے ذریعے۔

بس! ہمیں سوچنا ہے، تلاش کرنا ہے:

کیا آج بھی ایسی ندیاں موجود ہیں؟

اگر ہاں، تو اُن کی قدر کریں،

اور اگر نہیں، تو خود ایسی ندیاں بننے کی کوشش کریں۔

ایسا کرنے سے آپ کبھی بھی معاشرتی الجھنوں میں آ کر خودکشی جیسے فیصلے نہیں کریں گے۔

ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حقیقتِ زندگی

دوستو! آپ نے کبھی کرکٹ کی گیند دیکھی ہوگی، جس سے بچے اور بڑے سب کھیلتے ہیں۔ جب وہ گیند نئی خریدی جاتی ہے تو بڑے شوق سے سنبھال کر رکھی جاتی ہے، جیسے کوئی قیمتی خزانہ ہو۔ مگر جیسے ہی اس سے کھیل شروع ہوتا ہے، اس کے ساتھ حشر نشر بھی شروع ہو جاتا ہے۔ گیند باز اسے پوری قوت سے بلے باز کی طرف پھینکتا ہے، اور بلے باز بے رحمی سے ایسا شاٹ مارتا ہے کہ گیند سیدھی میدان سے باہر جا گرتی ہے۔ تماشائی تالیاں بجاتے ہیں، خوشی سے جھومتے ہیں — لیکن کیا کسی نے کبھی اُس گیند سے پوچھا کہ تم پر کیا گزری؟ وہ گیند ہر طرف سے مار کھاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی چمک اتر جاتی ہے، کھال اکھڑ جاتی ہے۔ پھر ایک دن وہ "ناکارہ" قرار دے دی جاتی ہے اور کسی غریب بچے کے ہاتھ آ جاتی ہے، جو اسے جوڑ توڑ کر دوبارہ کھیل میں لے آتا ہے، مگر اس بار بھی اسے صرف مار ہی کھانے کے لیے جوڑا جاتا ہے۔

دوستو! ایک انسان بھی اس گیند کی مانند ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی جاتی ہیں کہ اولاد عطا ہو۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو اس کی بڑی لاڈ پیار سے پرورش کی جاتی ہے۔ مگر جیسے ہی وہ نرسری کے قابل ہوتا ہے، اس پر "کتابوں کا بوجھ" ڈال دیا جاتا ہے۔ نانی اماں چاہتی ہیں وہ ڈاکٹر بنے، دادی اماں اسے انجینئر دیکھنا چاہتی ہیں، والد صاحب بیرونِ ملک بھیجنے کے لیے پیسے جوڑنا شروع کرتے ہیں۔ بچہ خاموشی سے درسی کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ اگر وہ کبھی تھوڑا سا غصہ دکھائے، تو ماں ٹی وی پر کارٹون لگا دیتی ہے اور خود اپنی سہیلیوں میں مگن ہو جاتی ہے۔ والد جب دفتر سے واپس آتے ہیں تو بچہ اُن سے لپٹنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن والد موبائل میں گیم کھول کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں اور خود دوستوں سے گپ شپ میں لگ جاتے ہیں۔

بے رحم وقت گزرنے لگتا ہے۔ وہی بچہ اسکول سے کالج، کالج سے یونیورسٹی، اور یونیورسٹی سے شادی تک پہنچتا ہے۔ اب نانی دادی کی خواہشات کے بعد بیوی اور بچوں کی خواہشات شامل ہو جاتی ہیں۔ انسان کبھی اِدھر مار کھاتا ہے، کبھی اُدھر —— جیسے وہی کرکٹ کی گیند ہو جسے کھیلنے والے بار بار میدان کے چاروں طرف دوڑا رہے ہوں۔ شریکِ حیات کی توقعات، اولاد کی ضروریات، دفتر اور کاروبار کی دوڑ —— سب مل کر اُسے ایک پیچ کے بعد دوسرے پیچ میں دھکیل دیتے ہیں، کبھی تماشائیوں کی داد، کبھی گھر والوں کے شکوے، اور کبھی زندگی کے باؤنسرز برداشت کرتا ہوا۔ اور جب وہ "ناکارہ" ہو جاتا ہے —— یعنی ریٹائرڈ —— تو یا تو اُسے حج پر بھیج دیا جاتا ہے، یا تبلیغ پر۔ اور اگر کچھ نہ ہوا، تو وہی گیند کی طرح گھر کے کسی کونے میں یا اولڈ ہوم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ گویا اب وہ بس ایک یادگار بن چکا ہے، یا شاید بوجھ۔

دوستو! یہ سارا حال اُس انسان کا ہے جو دنیا کی بھاگ دوڑ میں لگ کر اپنی ذات کو کھو دیتا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس گیند نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ صوفیاءِ کرام کی زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ خود کو دنیا کے درمیان "بال" بنانا پسند کرتے ہیں دوسروں کی خوشی کے لیے اپنے آپ کو تڑوانا، دوسروں کو تالیاں بجاتے دیکھ کر خوش ہونا، دوسروں کو فائدہ پہنچا کر خود چھپ جانا —— یہی ان کی شان ہوتی ہے۔ وہ خاموشی سے مار کھاتے ہیں، صبر کرتے ہیں، راضی بہ رضا رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی رضا میں خوش رہتے ہیں۔ یہ فرق ہوتا ہے ایک عام دنیاوی انسان اور ایک صوفی میں۔

اور اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ناکارہ تو دونوں صورتوں میں آخرکار ہو ہی جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ ناکارگی کس انداز سے حاصل کرنی ہے؟ یہ آپ پر منحصر ہے۔

فکر طلب

دوستو! ایک طالب حق کے لیے لازم ہے کہ: ہر وقت کان کھلے رکھے، زبان بند رکھے، مشاہدہ اور محبت کے رنگ اپنی آنکھوں میں سمیٹے رکھے، دنیاوی شغل کم سے کم کرے، اور یار کی یاری کو سچے دل سے تلاش کرے تاکہ اسے رسائی بھی نصیب ہو، اور پارسائی بھی۔
جب یہ راستہ اپنایا جائے تو: فکرِ نفس رفتہ رفتہ ختم ہونے لگتی ہے، انسان دوسروں کی توقعات سے آزاد ہو جاتا ہے، لب ذکر سے لذت پاتے ہیں، قلب ذکر سے منور ہوتا ہے، اور معرفت کی بینائی عطا ہونے لگتی ہے۔
پھر: نظرِ بصیرت حاصل ہوتی ہے، آخرت کی دور اندیشی دل کے قریب آتی ہے، فسق و فجور سے فاصلہ بڑھنے لگتا ہے، اور قربتِ محبوب میں وہ حال نصیب ہوتا ہے جہاں نہ کوئی گمان باقی رہتا ہے، نہ وہم کی کوئی وبا چھو سکتی ہے۔

صوفیت

دوستو! صوفی نہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے، نہ کسی بے بسی کا شکار ہوتا ہے، نہ کسی چیز کا آرزومند کہلاتا ہے، نہ ہی کسی بات پر غمزدہ یا افسردہ ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی سے تمنائیں جوڑتا ہے، نہ ہی مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ہر وقت رب کی رضا میں راضی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر وہ کام کرتا ہے، جس سے اس کا مالک اُس سے خوش ہو جائے۔
وہ صرف اسی ایک رمز کو تھامے رکھتا ہے نہ پیچھے بھاگنے کی خواہش، نہ حد سے بڑھنے کا ارادہ۔

وہ عاجزی اور خاموشی سے بیٹھا رہتا ہے، اس فکر میں گم جس میں ساری دنیائیں گم ہیں۔ وہ دنیا والوں کی کھیل کود کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے. کبھی اُن پر ہنستا ہے، کبھی خاموشی سے اُن کے حال پر روتا ہے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ

(بے شک انسان خسارے میں ہے)

اقتدارِ نفس

دوستو! ظاہری علوم کے حصول کے لیے انسان اپنی جوانی وقف کر دیتا ہے۔

اس راہ میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں:

ایک وہ جو علم کو جاننے اور سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور دوسرے وہ جو علم کے ذریعے صرف نوکری یا مناصب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ گزرِ معاش زندگی کی ضرورت ہے، مگر شوقِ علم رکھنے والا بھی محروم نہیں رہتا، وہ بھی ظاہری اور باطنی دونوں فوائد سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

فرق صرف نکتۂ نظر کا ہے؛ ایک شخص ان علوم کی گہرائی اور حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے، جبکہ دوسرا فقط دنیاوی روزگار کے حصول میں مصروف رہتا ہے۔

اسی طرح انسان کبھی اقتدارِ ہوس، کبھی اقتدارِ دولت، کبھی اقتدارِ نفس، اور کبھی سیرت و صورت پانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، اور ان کے حصول میں دیوانہ وار پھرتا رہتا ہے۔ جب بھی اسے دیکھا جائے، وہ اپنی فیلڈ میں دوڑتا، جدوجہد کرتا، نظر آتا ہے۔ یقیناً، جو بھی مقصد انسان چاہتا ہے—خواہ وہ دنیوی ہو یا روحانی اسے کامیابی اور ناکامی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی زندگی کی فطرت ہے۔ مگر ایک اور شخص بھی ہوتا ہے، جو اقتدارِ نفس یعنی نفس پر قابو پانے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ دن رات جستجو کرتا ہے، یہاں تک کہ اپنے نفس کو غلامی میں لے آتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو اس طرح پابند کرتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے جو حق اور سچ ہو، چاہے نفس کو وہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

ایسے لوگ قلندر کہلانے کے لائق ہوتے ہیں۔ ساری دنیا ان سے دعائیں لینے کے لیے ان کے پیچھے بھاگتی ہے، مگر وہ خود اپنے یار کی تلاش میں مست و محو رہتے ہیں۔ دنیاوی لذتوں اور عزتوں سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یہی مقصدِ عظیم سلوکِ قلندری کہلاتا ہے۔

دنیاوی چمک

دوستو! یقیناً میرا جسم میرا ہے، لیکن اس پر میرا حکم نہیں چلتا۔ اگر میرا حکم میرے بدن پر چلتا، تو میں اپنی جسمانی ساخت کو اپنی مرضی سے بدل لیتا۔ جو بھی خوبصورت اعضا پسند آتے، انہیں اپنے جسم میں فٹ کر لیتا۔ مگر ایسا ممکن نہیں۔

اگر میرا بس چلتا تو میرے اعضاء کبھی بوڑھے نہ ہوتے، ہر وقت تازہ، توانا اور جوان دکھائی دیتے۔ نہ عمر کی قید ہوتی، نہ کسی بیوٹی پارلر میں جانے کی ضرورت پیش آتی۔ سمارٹ نیس اور موٹاپے کی فکر سے بھی بے نیاز ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب صرف خیالی قصے اور کہانیاں ہیں دل کو بہلانے کے لیے۔

ایک کرونا وائرس نے ہی ہمیں دکھا دیا کہ انسان کی "اپنی مرضی" دراصل کتنی محدود ہے۔ اس نے پوری دنیا کے خود مختار بننے کے دعوے کو چند لمحوں میں زمین بوس کر دیا۔

ہم وہ انسان ہیں جن کے جسم اتنے کمزور ہیں کہ نہ سردی برداشت کر سکتے ہیں، نہ گرمی۔ اس لیے سوچو، غور کرو اور ڈرنا سیکھو اس خالقِ حقیقی سے جس نے ہمیں بنایا، جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اسی کے قائدے اور قانون کو ماننا ہی اصل زندگی ہے، ورنہ سب کچھ دھرا کا دھرا ہی رہ جائے گا۔

صحبت

اے انسان! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟ تم کیوں مایوس ہوتے ہو؟ یہ جو پریشانیوں کی گٹھڑی تم نے دن رات اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے، ذرا سوچو، اس میں آخر ایسی کون سی قیمتی شے ہے جسے تم محفوظ رکھنا چاہتے ہو؟

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ چور اور لٹیرے ہر راستے پر گھات لگائے بیٹھے ہیں؟ جہاں بھی جاؤ گے، وہ تمہارا پیچھا کریں گے۔

اگر تم نے اس سفر میں تھکن محسوس کی، لاپرواہی کی، تو جان لو تمہاری گٹھڑی چوری ہو جائے گی۔

اس لیے کوشش کرو، جاگتے رہو۔ سونے والوں کا سامان تو چُرایا جاتا ہے، مگر جاگنے والوں کا معاملہ کچھ اور ہے۔ لوگ اپنے قیمتی اثاثے جاگنے والوں کے سپرد کرتے ہیں، کیونکہ وہ پہریدار بن جاتے ہیں۔

پس تم بھی اپنی آنکھوں کو جاگنا سکھاؤ، مگر صرف آنکھوں کو نہیں اپنے دل کو بھی جگاؤ۔ اس دل میں عشق کا دیا جلاؤ، اور اس میں کثرتِ درودِ پاک کا تیل ڈالو۔ پھر یہ چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا، کبھی بجھے گا نہیں۔

بے شمار لوگ اس سفر میں جاگ رہے ہیں ان کی روشنی سے اپنا چراغ جلالو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب بیدار ہو چکے ہیں، اور ان کے دلوں کی روشنی پورے قافلے کا راستہ روشن کر رہی ہے۔

تم بھی ان ماہرین کی صحبت اختیار کر لو، یقین جانو، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ ورنہ اگر سو گئے، تو تم بھی اپنے سارے سامانِ حیات کے ساتھ لُوٹ لیے جاؤ گے۔

آخرت کا فکر

دوستو! اپنی خواب گاہ کو جنت بنانے کی کوشش چھوڑ دو۔ یاد رکھو! جنت تو برزخ کے بعد آنے والی وہ منزل ہے جہاں ہمیشہ کی راحت ہے، جبکہ دنیا کے محلات اور مکانات کا کچھ بھروسہ نہیں نہ معلوم کب تم سے چھین لیے جائیں۔

کتنی ہی جانوں کی حق تلفی کے بعد بننے والی یہ عالیشان عمارتیں تمہیں وقتی سکون تو دے سکتی ہیں، مگر حقیقی اطمینان نہیں۔ یہ نادانی ہے کہ انہیں قرارگاہِ ابدی سمجھ لیا جائے، کیونکہ ان میں کسی بھی وقت کوئی دوسرا آ کر بیٹھ سکتا ہے۔

یاد رکھو! تم اس دنیا میں صرف ایک مسافر ہو۔ لہٰذا اتنے وسیع محلات کے عادی مت بنو، کہ قبر کی تنگ سی جگہ تمہیں اجنبی لگنے لگے۔

اگر تم نے اپنی قبر کو اعمالِ صالحہ سے ایسا باغ بنالیا کہ وہ تنگی کے باوجود روشنی اور راحت سے بھر جائے، تو یہی تمہاری کامیابی اور تمہاری عقلِ سلیم کی پہچان ہو گی۔

آؤ، اپنے یار اُس محبوب ﷺ کا دامن تھام لو، جنہیں رحمۃٌ للعالمین کہا گیا ہے۔

اگر ہم نے ان کی تعلیمات اور ارشادات کے مطابق بارگاہِ الٰہی میں حاضری دی، تو یقین جانو، دنیا بھی جنت بن جائے گی اور آخرت بھی۔

إن شاءَ اللہ۔

شیخ کا تصور

چاہے روزمرہ کے معمولات ہوں یا کوئی کام، جب تک شوق، جستجو اور تڑپ نہ ہو، تب تک مقصد کی تکمیل مشکل اور پیچیدہ بن جاتی ہے۔

جب جنون شدت اختیار کرتا ہے، تو حصولِ مقصد ممکن ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ایک محبوب تک رسائی محنت طلب ضرور ہے، لیکن اِس جدوجہد کا سب سے اعلیٰ اعزاز دستورِ وفا ہے۔

جس نے بھی وفا کا علم بلند کیا، وہ اپنے محبوب کے قریب سے قریب تر ہو گیا —— چاہے محبوب دنیاوی ہو یا حقیقی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مجازی محبوب بھی حقیقت کی آشنائی میں ایک استاد کا کردار ادا کرتا ہے۔

تبھی تو صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ پہلے اپنے استاد کے قریب ہو جاؤ، یعنی فنا فی الشیخ ہو جاؤ۔

استاد کے قریب ہونے کا ہنر سیکھنے سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔

ایک شاگرد استاد کی ظاہری اور باطنی عادتیں اپنانے کی کوشش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ خود بھی ویسا ہی بننے لگتا ہے۔

نقل کرتے کرتے بالآخر وہ انہی صفات کا حامل ہو جاتا ہے۔

پھر اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، وہی کردار اُس کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے استاد میں گم ہو جاتا ہے۔

اس کا سارا دھیان اور سوچ استاد کے گرد گردش کرنے لگتی ہے۔

یہی ایک سالک اور طالب کا فعل اور اپنے مرشد، استاد سے تعلقِ روحانی ہے۔

راہِ نجات

اے انسان! جب تک تُو خود کو نہیں پہچانے گا، تب تک خالق کی دوسری مخلوق کو کیسے پہچان پائے گا؟ اسی لیے صوفیاء کرام نے زور دیا ہے:

"وفی اِنفسکم اِفلا تبصرون؟"

(تمھاری اپنی ذات میں نشانیاں ہیں، کیا تم غور نہیں کرتے؟)

خود کو تلاش کرو! اپنے باطن کی گہرائیوں میں جھانکو! اپنے آپ سے "میں" کو نکال کر باہر پھینک دو یہ کہنا چھوڑ دو کہ "میں وہ ہوں، میں یہ ہوں، میرا یہ نام ہے، میرا وہ مقام ہے، میری یہ شان ہے۔" ترک کر دو نفس کی وہ رسومات جو فتنہ پیدا کرتی ہیں۔ یاد رکھو! تم کچھ بھی نہیں ہو صرف ایک سانس ہو، جو کسی بھی لمحے رک سکتی ہے۔ پھر کیا کرو گے اپنے ناموں کا؟ آخرکار سب یہی کہیں گے: "ایک لاش ہے، ایک میت ہے، ایک جنازہ ہے!" کوئی یہ نہیں کہے گا کہ "فلاں وڈیرا تھا، فلاں رئیس تھا۔" "ایک کفن کے ٹکڑے میں لپیٹ دیے جاؤ گے۔ کہاں گئی وہ جائیداد جس پر تمہیں بڑا غرور تھا؟ جسے تم "میری" کہتے نہ تھکتے تھے؟ اگر واقعی تمہاری تھی، تو اب اسے کام لا کر دکھاؤ!

وہ زمینیں، وہ دولت، وہ حق جو تم نے غریبوں اور لاوارثوں سے چھین کر جمع کی تھی آج کس کام آرہی ہے؟ کہاں گئی وہ لاڈلی اولاد؟ جسے تم نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجا تھا؟ کہ معاشرے پر چھا جائے گی؟ آج وہ تمہارے کفن دفن میں شریک تک نہیں۔ اسے ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی، کیونکہ تم نے اُسے صرف دولت جمع کرنے کے لیے تربیت دی تھی محبت اور عقیدت سکھانے کے لیے نہیں۔ یاد رکھو! جو بیج تم نے بویا تھا، آج تم اُسی کو کاٹ رہے ہو۔

اے انسان! حقوقُ العباد اور حقوقُ اللہ دونوں کا خیال رکھو، تب ہی کامیاب ہو پاؤ گے۔ اپنی چاہتیں اُس (اللہ) کے سپرد کر دو۔ وہ تمہیں تمہاری چاہتیں بھی لوٹا دے گا، اور وہ کچھ عطا کرے گا جو تمہیں خود بھی معلوم نہیں۔

نعمتِ خداوندی

دوستو! مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ انسانیت کا اصل مقام کیا ہے۔ میں لاعلم تھا؛ دین و مذہب میرے لیے محض ایک رسم و رواج بن چکا تھا۔ میں دنیا کی بھاگ دوڑ میں اتنا آگے نکل گیا تھا کہ واپس پلٹنا میرے لیے ایک کرامت سے کم نہ تھا (یہ ایک دنیادار انسان کی داستان ہے)۔

یہی دنیا ہے جس میں خالقِ عظیم (اللہ تعالیٰ) نے اپنی تخلیقِ انسان میں نفس رکھااور اسے اشرفِ مخلوقات کاخطاب عطاکیا۔ ضرورتاً جس کو اعزازات، خطابات، ڈگریاں اور سرٹیفکیٹس ملتے ہیں، اس کے امتحانات بھی ہوتے ہیں، اور اس کے لیے انعامات و سزائیں بھی مقرر ہیں۔ مگر ساتھ ہی معافی اور تلافی کے راستے بھی دکھائے گئے ہیں۔ اگر کوئی ناامید ہو جائے تو اس کا بھی رزقِ اصلاح موجود ہے ورنہ بہت سی راہیں بتادی گئی ہیں۔

سوا لاکھ انبیاء کرام اور اللہ کے خاص بندے اصلاح کے لیے بھیجے گئے۔ کسی بھی صوفی بزرگ نے کبھی انسان کی ہدایت کے بدلے دنیاوی خواہشات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس، بعض نام نہاد لالچی، حاسد اور دنیا کے بھوکے لوگوں نے صوفیاءِ کے ناموں کو بدنام کیا۔ عوام الناس نے بھی برابر حصہ لیا —— انہوں نے روحانیت اور اصلاح کو محض دعاؤں، نمود و نمائش، تعویذ دھاگوں اور مختلف عملیات نما چیزوں تک محدود سمجھا اور اسی میں روحانیت کو ڈھونڈا۔ پھر وقت کے ساتھ وہ ناامید ہو کر شکوے کرنے لگے۔

آج کل بہت سے لوگ کسی خواب یا افسانے کی وجہ سے مزار یا درگاہ بنا کر متولی یا پیر بن بیٹھتے ہیں اور اپنا کاروبار چلا دیتے ہیں۔ مگر صوفیاء کرام کا پیغام ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ان کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا، اور دینی و اخلاقی تعلیمات کے مطابق اصلاح معاشرہ کرنا ہے ایسی اصلاح جو پورے معاشرے کے لیے مفید ہو۔

صوفیاءِ کا کام یہ باور کروانا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے، وہ معاف کرنے والا ہے، اور گناہگار انسانوں کے لیئے توبہ و اصلاح کا راستہ ہر زمانے میں مہیا ہے۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی غلط راستوں پر جانا چاہیے، خصوصاً وہ راستے جو جان و مال کے ضیاع کا سبب ہوں۔

ان راستوں کو چھوڑ کر اپنے محبوب ﷺ کی تعلیمات کی طرف آئیں: ان پر کثرت سے درود بھیجیں، ان سے محبت حاصل کریں، ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کریں۔ ایسا کرنے سے ساری زندگی بدل جائے گی؛ انسان کی طبیعت میں یکسوئی پیدا ہوگی، سکون و خوشی محسوس ہوں گی، اپنا اور غیر کا فرق سمجھ جائے گا، فریب و دھوکے کی عادات ختم ہوں گی، اور آپ کے ہاتھ پاؤں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

تلاشِ حق

جب کوئی کسی کی تلاش میں اس قدر گم ہو جائے کہ دن رات بس اسی کی سوچ میں مگن رہے، تب اس کی زندگی کا مقصد ایک ہی رہ جاتا ہے: وصالِ محبوب۔ خواہ حالات جیسے بھی ہوں، ظاہری علوم کے حصول کے لیے انسان اپنی جوانی قربان کر دیتا ہے۔ ایسے میں دو طرح کے لوگ نظر آتے ہیں:

ایک وہ جو علم کے شوق میں جیتے ہیں، جو علم کی گہرائی میں اترنا چاہتے ہیں، جو سیکھنے، سمجھنے، اور شعور حاصل کرنے کی جستجو رکھتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو علم کو صرف دنیاوی نوکری، عہدے اور مراعات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم کا مقصد صرف روزگار ہے۔

دونوں اپنی جگہ درست ہیں، کیونکہ دنیا کا نظام اور معاشی ضروریات اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں۔مگر فرق نکتہ نظر کا ہے۔ جو شخص علم کو شوق، محبت، اور عرفان کے لیے حاصل کرتا ہے،وہ محروم نہیں رہتا۔ وہ نہ صرف ظاہری کامیابیاں سمیٹتا ہے،بلکہ باطنی سکون، گہرائی، اور معرفت بھی پاتا ہے۔ اسی طرح انسان مختلف قسم کے اقتدار کے پیچھے اپنی زندگی قربان کرتا ہے: اقتدارِ ہوس، اقتدارِ دولت، اقتدارِ نفس، اقتدارِ صورت و شہرت ہر کوئی کسی نہ کسی میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے دوڑتا ہے، قربانیاں دیتا ہے، تھکتا ہے، گرتا ہے، سنبھلتا ہے، اور آخر کار یا تو کامیاب ہو جاتا ہے — یا ناکامی کے تجربے سے گزرتا ہے۔ یہی زندگی کی فطری سچائی ہے۔

لیکن ایک اور بھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں: وہ جو اقتدارِ نفس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ دن رات نفس کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔وہ اپنے نفس کو قابو میں لاتے ہیں، نفس کو پابند کرتے ہیں، اس سے وہ کام کرواتے ہیں جو نفس کو ناپسند ہوتے ہیں مگر جو روح کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو قلندر کہلانے کے لائق بنتے ہیں۔ پھر دنیا ان سے دعائیں لینے کے لیے پیچھے بھاگتی ہے، مگر وہ تو کسی اور ہی جستجو میں مست ہوتے ہیں اپنے یار کی تلاش میں۔ انہیں دنیا کی کسی چیز سے غرض نہیں رہتی۔یہی ہے سلوکِ قلندری ایک ایسا روحانی راستہ جس کا مقصد ہے: نفس کی غلامی سے آزادی، عشقِ حقیقی کی جستجو اور اللہ کی رضا میں فنا ہو جانا۔

ادب

آج کی اس وسیع دنیاوی مصروف زندگی میں آپ کو ایسے کئی اشخاص ملیں گے جو دفاتر میں بڑے۔بڑے عہدوں پر فائز ہوں گے، جو زندگی کی بھاگ دوڑ میں مصروف، سوٹ بوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر ان کے دل قلندرانہ صفات کے حامل ہوں گے۔ جب آپ کا ان سے واسطہ پڑے گا تو آپ کو ایک اور ہی دنیا نظر آئے گی۔

آپ محسوس کریں گے کہ یہ لوگ عام لوگ نہیں ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش یہ مصروفیات ضرور ہیں، مگر ان کے دل و دماغ کسی اور تربیت کے زیرِ اثر پروان چڑھ رہے ہوتے ہیں۔

ان کی کوششوں میں دن اور رات کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں سے اگر ملاقات ہو تو ان سے ادب سے پیش آنا، ان کی کاوشوں کی قدر کرنا، اور ان کے قیمتی وقت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

فضول اور غیر ضروری باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔

مٹی کی خوشبو

اگر، دوستو! تم اپنی خواہشات، تمنا اور نفس کو مٹانا چاہتے ہو تو کسی عاشقِ الٰہی کو تلاش کرو۔ ایسے بندے کو دیکھنے کی کوشش کرو جس نے دنیا کو چھوڑ کر حق کو پالیا ہو۔ لیکن اس کے لیے کچھ شرائط ہیں:

سب سے پہلے، اپنے آپ کو دنیاوی مشغولیات سے کچھ وقت کے لیے فارغ کرو اور کسی ولیءِ کامل کی درسگاہ کا رخ کرو۔

وہاں دور سے، خاموشی اور سکون کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور صرف دیکھنے کی کوشش کرو۔ درگاہ پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، مگر تم دل کو ہر چیز سے بے پرواہ کر کے، بس اسی مقام کو خاموشی سے دیکھتے رہو۔ پھر اپنے دل سے سوال کرو:

"یہ ایک قبر ہے مٹی کی بنی ہوئی اس میں بھی ایک جسم ہے، مٹی ہی کا بنا ہوا مگر باہر قبریں بھی تو ویسی ہی ہیں ان پر نہ چادریں، نہ خوشبو، نہ قرآن، نہ تلاوت، نہ حاضری، نہ آنسو۔ تو آخر یہاں کیا راز ہے؟ کیا ماجرا ہے؟"

سمجھ لو یہ فرق محبت کا ہے، یہ قبر کسی عاشقِ الٰہی کی ہے جس نے دنیا میں اپنے نفس کو فنا کر کے، رب کی حقیقت کو پالیا۔ وہ مٹی کا جسم تو مدفون ہے، مگر اس کے اندر جو روحِ حق ہے، وہ زندہ ہے اسی کی خوشبو ہے، اسی کی تاثیر ہے، اسی کی کشش ہے جس کے لیے لوگ دور دور سے فقیروں کی طرح مانگنے آتے ہیں۔

اس عاشق نے اپنے رب کی قُربت پالی، اور وہ قربت آج بھی لوگوں کو نور کی صورت میں ملتی ہے۔

اب تم! تم بھی اُس کی خوشبو کو اپنی معشوقہ بنالو رب سے بھی اسی خوشبو کی چاہت کرو۔ جس رب نے اُس بندے سے راضی ہو کر اسے قربِ خاص عطا کیا، وہ تم سے بھی راضی ہو جائے گا بس تم دل کو اس سے جوڑ لو۔

وہ راستے تلاش کرو، جو اُن اللہ کے دوستوں نے تلاش کیے تھے۔ آج وہ جو دنیا میں فنا ہو چکے تھے، وہی باقی دکھائی دے رہے ہیں۔ اور یہ صرف اور صرف اللہ کے فضل، رحمتِ رسول ﷺ اور درودِ پاک کی برکت سے ممکن ہوا ہے۔

اے زمانۂ حال کے انسان! ذرا ٹھہر، غور کر! اپنے غم، فکر، انا، ضد سب کو ایک طرف رکھ دے۔ اپنے غرور کو نکال دے، اپنی خودی کو تھام کر عاجزی خرید لے۔ صبر، شکر، استقامت، پابندی کے ساتھ بس لگ جا درودِ پاک پر کیونکہ وہی ایک راستہ ہے جو محبوب ﷺ تک، اور محبوب ﷺ کے رب تک لے جاتا ہے۔

آخر میں یہی کہوں گا:

ماشاء اللہ!

اللہ تعالیٰ نے ہمیں محروم نہیں رکھا دنیا اور آخرت کی سب نعمتیں ایک ہی کوزے میں بند کر کے، "درودِ پاک" کی صورت میں امت کو عطا کر دی ہیں۔

الحمد للہ!

نسبت و رغبت

دوستو! مارکیٹ میں ہر قسم کی چیز پر بیچنے کے لیے لائی جاتی ہے۔ یہ چیزیں اپنی جسامت، معیار اور ضرورت کے مطابق خریدی جاتی ہیں اور ان کے گاہک اپنی سوجھ بوجھ سے انھیں پہچان کر خریدتے ہیں۔ اگر کوئی خریدار اناڑی یا ناتجربہ کار ہو، تو وہ فریب اور دھوکے کے دائرے میں آ کر غلط سودا کر بیٹھتا ہے۔ لیکن ایک ماہر اور سمجھ دار خریدار ہمیشہ دیکھ بھال کر، پرکھ کر ہی خریداری کرتا ہے۔

دوستو! یاد رکھو، یہ دنیا بھی ایک مارکیٹ ہے۔ اس میں ہر قسم کی چیز خرید و فروخت کے لیے موجود ہے: اصلی بھی، نقلی بھی؛ پرانی بھی، جدید بھی؛ عارضی بھی، اور ہمیشہ رہنے والی بھی۔ یہ سب تمہارے ایمان، عقل، اور نیت پر ہے کہ تم کیا خریدنا چاہتے ہو؟ فقط وقتی فائدہ؟ یا وہ متاع جو ہمیشہ کے لیے فائدہ دے؟ جب ہمیشہ رہنے والی، اصل اور عمدہ چیزوں کا سودا کرنا ہو تو کسی ماہر، رہبر، یا نیک سیرت راہنما سے رہنمائی لینا عقلمندی ہے۔ ورنہ وقت گزر جائے گا، اور تم لُٹ جاؤ گے۔

دوستو! دیکھو اُن لوگوں کو جنھوں نے زندگی کی مارکیٹ میں محض وقتی چیزیں خریدیں، صرف وقت گزارا آج ان کی قبریں ویران ہیں، ان کا کوئی نام لینے والا نہیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے نایاب اور قیمتی متاع ان لوگوں سے حاصل کی، جو دھوکے باز نہ تھے آج ان کی قبریں آباد ہیں۔ ان کے افکار، ان کے فلسفے، ان کی باتیں آج بھی زندہ ہیں، لوگ ان سے روشنی لیتے ہیں۔ سوچو! نقل سے بچو، اصل خریدو! وقتی چیزوں کے پیچھے مت بھاگو ہمیشہ رہنے والے سودے پر نظر رکھو!

صبر و استقامت

دنیا اور زندگی ان دونوں کا ایک گہرا تعلق ہے۔ عجیب الجھنیں ہیں جو ہر وقت، کبھی کم، کبھی زیادہ، انسان کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ یہ سب خدائی دستورِ فطرت ہے، جو ہر دم رواں دواں ہے۔

دنیا میں جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کو پسند آئے کیونکہ ہر شخص کی پسند، ناپسند، دوستیاں، دشمنیاں، اور اُن کے دائرہ کار، سب الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاءِ کرام کی دوستی اور دشمنی بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔

ان کی دشمنی کسی اور سے نہیں، اپنے نفس سے ہوتی ہے اپنی خواہشات سے، جو دن رات ان پر حملے کرتی رہتی ہیں۔

صوفی ہر وقت اس اندرونی دشمن سے نبرد آزما رہتا ہے، اور اسے شکست دینے کے لیے مختلف روحانی حربے اختیار کرتا ہے۔ وہ خود پر نظر رکھتا ہے، مسلسل اس نفس پر وار کرتا ہے، تاکہ یہ دشمن زندگی کے کسی موڑ پر غالب نہ آ جائے۔ یہ جنگ زندگی کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔

اس جنگ میں کامیاب ہونے کے لیے وہ ایک "حال بخشنے والا" ڈھونڈتا ہے جو اسے حملوں سے بچنے، ان کے جواب دینے اور نفس کو قابو میں رکھنے کا سلیقہ سکھائے۔ اسی "حال بخشنے والے" کو صوفیانہ زبان میں "استاد"، "رہبر"، اور "مرشد" کہا جاتا ہے۔

صوفی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی صحبت میں رہے، مگر کبھی کبھار دنیا کی گردشوں میں گم ہو جاتا ہے تب اُس پر کالے لمحے آتے ہیں۔ اور اچانک وہ چونک اٹھتا ہے، گہرے سانس لیتا ہے، اور دل سے پکار اُٹھتا ہے:

" مرے دوست ! مجھ پہ ایسا ہاتھ رکھو، کوئی ایسی ضرب لگاؤ کہ یہ روز روز کی لڑائی ختم ہو جائے، میرا قلب بے چین ہے ! "

اگر کبھی اس کے منہ سے زور سے کوئی صدا نکل جائے تو لوگ اسے پاگل سمجھ کر ہنس پڑتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے بس ہوتا ہے کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ اس کے اندر صبر کی کمی ہو جاتی ہے۔ وہ کس سے جا کر کہے کہ :

" میرے استاد نے مجھے ایک ایسی جنگ میں ڈال دیا ہے جہاں ایک طرف دنیاوی خواہشات ہیں، اور دوسری طرف محبوب کی محبت نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے ! "

ایک تصویر اور ایک تسبیح کے ذریعے سے اسے ایسے آقا سے ملا دیا گیا ہے، جو اُسے سونے نہیں دیتے ! دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ اسے اپنی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں۔

کبھی تہجد کی صورت میں، کبھی فرائض کی ادائیگی میں، کبھی انسانوں کی خدمت میں، کبھی تعلیماتِ محمدی ﷺ پر عمل کی تڑپ میں وہ ہر لمحہ قریب تر آتا جاتا ہے۔

عجب ماجرا ہے !

صوفی خاموش بھی نہیں رہ سکتا، اور بولے تو کیا بولے ؟

کس سے جا کر کہے کہ :

" کس نے اپنی اداؤں سے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں اُس کا ہو چکا ہوں جس کا سارا جہاں ہو چکا ہے ! "

آؤ! رحمتُ للعالمین ﷺ پر کثرت سے درود پاک بھیجیں۔ یہی وہ چراغ ہے جو انسان کے باطنی اندھیرے میں روشنی کرتا ہے، اور ہمیں محبوب کے قریب لے جاتا ہے۔

روحانی راز

جس سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے، سب سے پہلے اُسے دوست اور دشمن کی پہچان سکھاتا ہے۔ پھر اس کے سامنے ایسے لوگوں کے کچھ رویے آتے ہیں، جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اکثر یہی لوگ اُسے تنہا کرنے میں کردار ادا کرتے ہیں، جو کبھی "ہمیشہ ساتھ ہوں گے" جیسے جملے دہرا کر اس کے قریب رہتے تھے۔ پھر وہی لوگ مختلف انداز سے تکلیفیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن جب انسان ان سب اذیتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے، تب ہی وہ شخصیت میں چھوٹا نہیں بلکہ بہت بڑا بن کر اُبھرتا ہے۔

زندگی کو قریب سے، گہرائی سے دیکھو۔ کئی چالاک اور جلد باز لوگ اپنے ہی قدموں میں الجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے اندر ایک انجانا سا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں میری جگہ کوئی اور نہ آ جائے۔

یہ سب رنگ بے رونق ہو جاتے ہیں، جب توکل کا سفینہ لہرانے لگتا ہے، تو بظاہر لگتا ہے کہ ڈوب جائے گا — مگر وہی کشتی کامیابی سے ساحل پر پہنچتی ہے۔

یہ سارا عمل ایک روحانی راز ہے، جسے سمجھنے کے لیے دل کا دروازہ کھلا ہونا ضروری ہے۔

زندگی کا سفر

دوستو! زندگی کے کئی رخ اور نمونے ہوتے ہیں کبھی بچپن، کبھی جوانی، تو کبھی بڑھاپا۔ یہ سب چیزیں ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتیں؛ کسی کو بچپن ملتا ہے مگر نوجوانی نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ موت جوانی تک پہنچ کر روک سکتی ہے۔ کسی کو نوجوانی نصیب ہوتی ہے مگر بڑھاپا نہ ملے۔ یہ سب اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر کی باتیں ہیں جنہیں ہم پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔

کبھی بچپن میں والدین کا پیار، ناز و نخرہ نصیب ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ بعض کے والدین اُن کے لیے حاضر و مقیم ہوتے ہیں، تو بعض کے والدین اتنے مصروف کہ بچوں کو وقت ہی نہیں دے پاتے۔ کہیں پالنا پیار سے ہوتا ہے، کہیں بچے کو منتقل کر دیا جاتا ہے، یا بعض اوقات دوسری شادیوں کے سبب بچے پسِ منظر میں رہ جاتے ہیں۔ یہ سب زندگی کے تلخ حقائق ہیں جو ہم معاشرے میں ہر طرف دیکھتے ہیں۔

اب جوانی کے معاملے پر آئیں تو حالات اور ماحول کا اثر بہت واضح ہوتا ہے۔ بعض خاندان اپنی اولاد کو اخلاقی تربیت سے دور رکھتے ہیں؛ چھوٹی عمر ہی میں وہ برائیاں اختیار کر لیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں شعور ہی نہیں ہوتا حرام حلال کی تمیز نہیں سکھائی جاتی۔ صرف ایک مخصوص اسٹائل، شہرت، اور دوستوں کے چکر ان کی ترجیح بن جاتے ہیں۔ پھر فاصلے بڑھتے ہیں، اور کبھی ناگہانی آفات بھی آ جاتی ہیں۔

ایک طبقہ مڈل کلاس کا ہوتا ہے جنہیں بھی "بڑھتی ہوئی خواہشات" کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے وہ بھی ان بلند مقام رکھنے والے لوگوں کے انداز اپنانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ تعلیم حاصل کرکے نوکریاں پاتے ہیں اور پھر ان شاندار طرزِ زندگی کی طرف بڑھتے ہیں؛ کوئی محنت مزدوری کرکے، کوئی سیاسی یا سماجی حلقوں میں شامل ہو کر وہ مقام حاصل

کرتا ہے۔ اکثر بڑھاپے میں یہ لوگ پشیمان ہوتے ہیں پھر ذہنی دباؤ، بیماریوں کی ایک لمبی فہرست بن جاتی ہے۔

ایک اور طبقہ وہ ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے؛ اپنی جوانی اپنے خاندان کی کفالت میں گزارتا ہے، بہن بھائیوں کی خوشی کے لیے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ اور بدقسمتی سے ایک طبقہ اور بھی ہے جو غلط صحبت میں آ کر چوریاں، منشیات اور دیگر برائیوں میں پڑ جاتا ہے یہ سب جب بڑھاپے میں پہنچ کر سوچتے ہیں تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

دوستو! میری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی شعبے یا معاشرت سے تعلق رکھے، لیکن جوانی کو عقل و فہم سے بسر کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ سعدیؒ نے فرمایا:

در جوانی توبہ کردن شوکہِ پیغمبری
وقتِ پرای گرگِ ظالم می شود پرہزیگار

جوانی ایک نعمت ہے اس میں انسان سنبھلتا بھی ہے اور پھسل بھی جاتا ہے، اور پھر اس کا پھل زندگی اور آخرت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ توبہ کا مطلب ہے اپنی نادانیوں کو چھوڑ دینا۔ اگر تمہیں نصیحت کرنے والا کوئی نیک راستہ دکھائے، تو اسے چھوڑو مت اس کی باتوں کو اپناؤ اور عمل کرو۔ اس کا فائدہ تمہیں، تمہاری اولاد کو اور تمہارے تمام معاشرے کو ملے گا۔

ندامت اور توبہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کا راستہ ہے اسے معمولی خیال نہ کرو۔ جوانی ختم ہو کر ایک بھوکا بوڑھا بن کر پھر پچھتائے گا تو کیا حاصل؟ موت ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دیتی۔ للذا آؤ میرے بچوں! اس جوانی کو سنبھالو: ہر بدکاری سے بچو، ہر بدمعاشی کو چھوڑ دو، اور اس نعمت کو رحمت سمجھ کر حاصل کرو۔

آغاز کرو کثرتِ درودِ پاک پڑھنے اور پڑھانے کا یہی وہ عمل ہے جو دل کو صاف کرتا، راہِ حق دکھاتا، اور دنیا و آخرت میں بھلائی کا باعث بنتا ہے۔

حکمت و بھلائی

دنیا کی تاریخ، بنی آدم کی پیدائش سے لے کر فلاسفروں کے فلسفے تک، اور مذاہب کی روشنی میں جو بات میں نے سمجھی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود انسان ہی ہے۔

اگر اور گہرائی سے دیکھا جائے، تو حقیقت یہ ہے کہ انسان خود اپنی زندگی کا سب سے خطرناک دشمن بن جاتا ہے۔

وہ اپنی خواہشات کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے نہ صرف اپنی صحت، بلکہ اپنے رشتے، سکون، اور اصل زندگی بھی کھو دیتا ہے۔

اسے ہوش تب آتا ہے جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اپنے مفادات کے لیے اپنوں اور غیروں سے جھوٹ بولتا ہے، چپکے سے چوریاں کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کر لیا ہے۔

مگر یہی غرور، تکبر، شیطانی چالیں اور منافقانہ ہتھکنڈے اس کی ساری خوشیاں تباہ کر دیتے ہیں۔ جب اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جس زندگی کو اُس نے "بقا" سمجھ کر اپنے اور اپنی اولاد کی صحت، سکون، عزت، سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، تو وہ سوچتا ہے: "کیا واقعی میں نے سب کچھ اپنی مٹھی میں لے لیا ہے؟"

لیکن پھر وہ اس تلخ حقیقت پر آ کر رُک جاتا ہے کہ: مٹھی بھر مٹی بھی میری نہیں ہو گی، وہ بھی کوئی اور مجھ پر ڈالے گا۔ مرنے پر بھی اختیار نہ چلے گا۔

ذرا سوچو۔ ترقّی ضرور کرو، رزق تلاش کرو، دولت، اقتدار، کوٹھیاں، سواری یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

لیکن دوسروں اور خود کو دھوکہ دے کر دل کو خوش نہ کرو۔ ان چیزوں کو عارضی سمجھو، تو یہ نعمتیں بھی قائم رہیں گی اور نعمت دینے والا بھی راضی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا راستہ تلاش کرنے کی توفیق عطا فرمائے، جو نہ صرف ہمیں دنیا میں سکون دے بلکہ آخرت میں بھی فلاح کا ذریعہ بنے۔ آمین۔

دوسری طرف:

انسان کی تاریخ میں کچھ ایسی شفیق، باکردار اور الہامی شخصیات بھی آئی ہیں، جنہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے انسانی زندگی کو نکھارا، سنوارا اور کامل بنانے کے لیے بے شمار قربانیاں دیں۔

ان میں سب سے بلند مقام حاصل ہے: خاتم النبیین، حضرت محمد ﷺ کو آپ کے تربیت یافتہ اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ کے خاندانِ مبارک کو اور آپ کے بعد آنے والے صوفیاءِ کرام رحمہم اللہ کو جنہوں نے انسانیت کی بھلائی کے لیے اپنی خواہشات، مال، وقت اور حتیٰ کہ جان تک قربان کر دی۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنے عمل سے بتایا کہ اصل کامیابی، رضائے الٰہی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، اور ہمیں بھی ایسے ہی راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کاریگر کی ضرورت

دوستو! دیکھو، مٹی تو مٹی ہی ہوتی ہے، مگر اسے کارآمد بنانے کے لیے کسی ماہر کاریگر کے ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جتنا زیادہ وہ کاریگر ماہر ہوگا، اُتنا ہی وہ مٹی کو خوبصورت بنا کر، نرم و ملائم کرکے، کسی سانچے میں ڈھال کر قیمتی برتن یا اینٹیں تیار کرے گا۔ پھر انہیں پکا کر بھٹی میں جلائے گا، کوئلوں پر رکھ کر رنگ بھر دے گا۔

یوں اگرچہ وہ مٹی سنگِ مرمر تو نہیں بنتی، مگر کاریگر کے ہاتھوں کی تراش خراش، رنگ و روغن، اور محنت کے بغیر کبھی قیمتی نہیں بن سکتی۔

دوستو! انسان بھی بالکل اسی طرح ہے۔ جب تک وہ کسی ماہر استاد کی رہنمائی اختیار نہیں کرتا، اس کی صحبت میں نہیں بیٹھتا، اور عملی زندگی میں تجربہ حاصل نہیں کرتا، تب تک وہ حقیقی معنوں میں باکمال انسان نہیں بن سکتا۔

ایسا انسان وہی ہے جس کی شخصیت میں نکھار آئے، جس کی انسانیت خوش و خرم اور روشن نظر آئے، اور جو اپنی چمک دوسروں تک پہنچا کر انہیں بھی اپنا ہم نشین بنا لے۔

روشن چراغ

دوستو! اندھے کے لیے کنواں بھی ویسا ہی ہوتا ہے، جیسے ہموار زمین۔ میرا مقصد اندھے کی مثال دیکر اندھے کی توہین نہیں، بلکہ میرا مطلب اُس اندھے سے ہے جو نُورِ بصیرت اور انسانیت کی آنکھوں سے محروم ہے۔ ویسے تو وہ ظاہری بینائی رکھتا ہے، مگر سوچنے اور سمجھنے میں اُس کی بینائی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ جب اُس کے مفادات کا ٹکراؤ معاشرے میں کسی سے ہوتا ہے تو وہ سب رشتے اور ساری اچھائیاں بھول جاتا ہے، بس اپنے آپ کو سب سے آگے رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔

ایسے شخص کو وہ روشنی کہاں نظر آئے گی جس کی ہم بات کرتے ہیں؟ میرا مطلب ہے صوفیانہ طرزِ عمل کی روشنی ایسے شخص کے لیے آپ ہزاروں چراغ بھی جلالیں، پھر بھی وہ نہ روشنی دیکھ پائے گا، نہ اچھائی۔ تو بتایئے، وہ کیسے راستہ دیکھ پائے گا؟ وہ کیسے منزل تک پہنچ سکے گا؟ وہ تو ابھی تک اپنے آپ کو راضی کرنے میں مست ہے، وہ چھوٹی چھوٹی لکیروں کے دائروں میں پھنسا ہوا ہے۔

آیئے! اُسے نکالیں اُن کامل ہستیوں کے پیغام کے ساتھ، جنہوں نے اپنے آپ کو پہچانا، پھر اپنے آپ کو اپنے "اَنا" سے الگ کیا، پھر اپنے اندر عاجزی کی خلوت ڈال کر خود کو مٹادیا۔

ماشاءاللہ! پھر انہوں نے انسانیت کو پایا، اسے سینے سے لگایا، پھر اس انسانیت کو مسلمان بنا کر کلمۂ حق پڑھایا، پھر اسے حقیقی مالک سے روشناس کروایا، اور اسے اندر کی آنکھوں سے دیکھنا سکھایا۔ انہوں نے ایک ایسا صوفیانہ چراغ جلایا جو صدیوں گزر جانے کے بعد بھی روشن ہے، جو آج بھی اپنی تعلیمات کے ساتھ چمک رہا ہے۔

دوستو! ایسے ہی چراغ کو تلاش کرو، اور وہ روشنی پاؤ جس میں نہ کوئی فتنہ ہو، نہ فساد، نہ حسد ہو، نہ غصہ بس وہ چراغ دوسروں کو روشن کرتا رہے، یہی اُس چراغ کی اصل خوبی ہے۔

راہِ فقر

دوستو! جب کوئی طالبِ فقر، خدمتِ فقراء انجام دینے لگتا ہے، تو اس پر وسعتِ نظر اور فراخیِ دل کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ اس کے ذہن میں خیالاتِ فکر و معرفت کا نور اترنے لگتا ہے، اور وہ ایک بڑی پیش رفت کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے یعنی حقیقی راہِ فقر کی طرف۔ ایسے راستے میں یقیناً سختیاں آتی ہیں، وقتاً فوقتاً آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، مگر انہی آزمائشوں پر صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی خصوصی خوشنودی حاصل کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جو شخص اس راہ میں فقراء کی خدمت میں لگا رہتا ہے، وہ دراصل اپنی نصب و قسمت کو بہاروں سے بھر دیتا ہے۔ پھر وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ اُسے دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتوں سے نواز دیتا ہے۔

علم کی حکمت

"اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی جاہل کو اپنا نائب یا ولی نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے علم کے لیے اپنے صحیفے اور کتابیں اپنے برگزیدہ بندوں پر نازل فرمائیں، اور انہیں علم سے نوازا۔ جب اللہ تعالیٰ نے علمِ ذات کو سمجھنے کی دعوت دی، تو ہم صرف اپنی ذات میں محدود ہو کر رہ گئے۔ جب علمِ صفات کی بات کی گئی، تو ہم نے اپنے نام اور شہرت کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے علمِ اسماء کی طرف متوجہ کیا، تو ہم دنیا کے اعداد و شمار میں گم ہو گئے۔ جب علمِ افعال کی طرف بلایا، تو ہم نے کردار بگاڑ دیے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں علمِ احکام کی طرف بلایا، تو ہم نے اس کی صریح خلاف ورزیاں شروع کر دیں۔

اب بھی وقت ہے پلٹ آؤ، اس کی طرف رجوع کرو۔ سیکھنا شروع کرو اُن سے، جن کے پاس واقعی علم ہے۔"

منافقت اور بدبختی

بدبختی کی اصل صورت اور بخت کا امتحان، بدبخت وہ انسان ہوتا ہے، جو اپنے بخت کو اپنی مغروری کے نشے میں آ کر لات مار دیتا ہے۔ لیکن یاد رکھو، وقت بھی ایسا وار کرتا ہے کہ انسان کو سیدھا ہونے میں پوری زندگی لگ جاتی ہے۔ اگر زندگی میں آپ کو قسمت سے کوئی اچھا موقع ملا ہے، کسی نے سیڑھی لگا کر آپ کو اوپر چڑھنے میں مدد دی ہے، تو اُس موقع کو غنیمت جانو! وہ سیڑھی، ممکن ہے آپ کے استاد کی محنت، یا والدین کی دعا اور ان کی تربیت کا نتیجہ ہو۔

لیکن اگر آپ نے اُس موقع کی قدر نہ کی، یا غرور میں آ کر پھسل گئے، تو پھر دوبارہ ویسا موقع شاید کبھی نہ ملے کیونکہ وہ اسباب جو پہلے مفت میں مل رہے تھے، اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔ یہ سب کچھ "بخت" اور "نصیب" کا کرشمہ ہوتا ہے۔

اچھے دنوں میں ہر کوئی آپ کا دوست بن جاتا ہے۔ بعض تو اتنے مخلص بن کر ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، جیسے وہ آپ کے سائے سے بھی زیادہ وفادار ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ منافق صرف اچھے وقت کا دوست ہوتا ہے۔

جیسے ہی وقت کا رخ بدلتا ہے، وہی منافق الٹے پاؤں بھاگنے لگتا ہے۔ وہ آپ کے سامنے آ کر بیٹھتا ہے، اور یہ مت بھولیں کہ وہ اسی احسان کی بدولت وہاں پہنچا تھا، جو آپ نے کبھی اُس پر کیا تھا۔

لیکن وہ شخص، جو آپ کے بے بسی کے دنوں میں قدم بہ قدم آپ کے ساتھ رہا، وہی آپ کے بخت کا سچا ساتھی ہے۔اسے کبھی مت کھونا! بخت ایک حقیقی احساس ہے،

جو آپ کو اچھے لوگ عطا کرتا ہے ایسے لوگ جو آپ کو آپ کے اخلاق، سچائی، اور سوچ کی بنیاد پر پسند کرتے ہیں، نہ کہ آپ کے منصب یا ظاہری حیثیت پر۔

جو دوستی منصب کی بنیاد پر ہو، وہ دراصل منافقت کا کاروبار ہے۔اور جب یہ منصب کی سیڑھیاں ٹوٹتی ہیں، تو وہی منافق لوگ، دوڑتے ہوئے آپ کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

جیسے تاریخ میں ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے خُونِ مبارک کا دعویٰ کرنے والے، پھر منصب کے پیچھے دوڑ گئے، اور مسلم بن عقیلؓ سے لے کر کربلا تک ان کے دعوے، احادیث، کلمہ اور نسبتیں سب کچھ بھول گئے۔

ایسے منافقین کو آج بھی سوچنا چاہیے، کہ ابھی بھی وقت ہے: اپنے بخت کو سنبھال لو! اسے ضائع نہ کرو، جو تمہیں ایک کامل استاد، اور والدین کی دعا سے تحفے میں ملا ہے۔

فنا و بقا

بس بیٹے، دنیاوی زندگی یہی ہے۔انسان نہ جانے کیا کچھ سوچتا رہتا ہے، مگر جو وقت ازل سے مقرر ہے، وہ اپنے وقت پر، بغیر کسی اطلاع اور اجازت کے، اچانک آ پہنچتا ہے۔ پھر ساری خواہشیں، حسین تمنائیں، اور امیدیں اس بے وفا دنیا میں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

دنیا بس ایک مہلت ہے غور و فکر کی۔ وقت آتے ہی زندگی کی ساری رعنائیاں، رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو سوچ سمجھ کر، سچائی کے راستے پر چلے، وہ بقا پا گئے۔اور جو ضد، غرور اور خود غرضی میں مبتلا رہے، وہ ناکامی اور نامرادی کے اندھیرے گڑھوں میں پھنسے رہ گئے۔ وہ حسد اور جلن کی آگ میں جل جل کر، روحانی اور جسمانی طور پر راکھ ہو گئے۔

زندگی میں جو وقت غور و فکر کے لیے ملا ہے، اسے غنیمت جانو۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ کا خیال رکھو۔ دنیا میں رہو، لیکن موت کو یاد رکھتے ہوئے جیو۔ کبھی بھی نفس کے دھوکے میں نہ آنا۔ جو آئے، ان کا انجام اور حشر دیکھو۔

وقت کے بہاؤ بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ صرف آبادی دیکھ کر خوش نہ ہو، ویرانی اور قحط کے خطرے سے ڈرو۔ ویرانی اور قحط کے بھی کئی روپ ہوتے ہیں، جیسے کہ آبادیوں کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کی بستیاں صدیوں بعد بھی آباد رہیں، انہیں دیکھ کر سمجھو کہ آبادی اور ویرانی کے فلسفے کی کیا اہمیت اور حقیقت ہے۔

نقالی سے بچو

جاگنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کچھ لوگ سوتے ہوئے بھی جاگتے ہیں، اور کچھ جاگتے ہوئے بھی سوئے ہوئے لگتے ہیں۔ اختلاف اور اتفاق تو چلتے رہیں گے، مگر یہ عمل اصلاحی اور تعمیری ہونا چاہیے۔ اگر تنقید کا مقصد حسد اور جلن پر مبنی ہوگا، تو نتائج بھی ویسے ہی منفی اور زہریلے نکلیں گے۔

اختلاف رکھنا ہر کسی کا حق ہے، لیکن ہر بات پر ضد اور انکار کرنا دراصل اتفاقِ رائے کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔

آج کل کا دور "کاپی پیسٹ" کا ہے۔ ہیئر کٹنگ ہو یا ڈریسنگ، حتیٰ کہ چہرے کے بال — یعنی مونچھیں اور داڑھی بھی بس اسٹائل مارنے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اگر کسی بڑے بھوتار (بااثر شخص) کے ہاتھ میں دو ٹچ فون ہوں، تو چھوٹے بھوتار بھی وہی سین بناتے ہیں۔ اور چلنے، بولنے، رہنے سہنے کے انداز کو "سیم ٹو سیم" نقل کیا جاتا ہے۔

کاپی پیسٹ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اگر کسی مشہور شخصیت کی نقل کرنی ہو تو بار بار ریہرسل کرنا پڑتی ہے — وہی ڈریسنگ، وہی لہجہ، وہی جملے۔ حتیٰ کہ ٹوپی اور سر کے بال تک ویسے ہی رکھنے پڑتے ہیں، جیسے کسی کو تیسری جنس والے انداز کا شوق پیدا ہوگیا ہو۔ کچھ نہ بنے، تو بس کمر کے بل جھکنے کی عادت ہی سہی لیکن وہ عادت پوری ضرور کرنی ہے۔

دنیا ٹیکنالوجی کی طرف تیزی سے جارہی ہے، اور ہم اب بھی لالچی لومڑیوں کی قطار میں، خود کو اور دوسروں کو کھڑا کیے بیٹھے ہیں۔ کسی مشہور مقرر کا انداز خواہ مخواہ اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شرم جیسے مرگئی ہو — ناک ہے، لیکن اس میں غیرت کا پانی نہیں رہا جس میں غوطہ زن ہوسکیں۔

جنھوں نے ہمیں جمہوریت کا سبق سکھایا، آج اُن کی اولادیں بے روزگار، بے سہارا، گروہ در گروہ، کبھی فقیری تو کبھی صوفی کا لبادہ اوڑھے، سڑکوں پر بھٹک رہی ہیں۔ "ونگاری" بھوتار لائینیں لگا کر، بڑے بڑے نعرے لگاتے، اور چکر کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

نقلی لیڈر (جعلی رہنما) اپنے ہاتھ چوموانے کے لیے ایسے ایسے ڈرامے کرتے ہیں کہ اُن کے کاروباری پارٹنر، آپس کی لڑائیوں سے بچنے کے لیے چپ سادھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے سورج کی روشنی بھی بس ایک دکھاوا ہے۔ اماڑے (خاوند) اور اماڑیاں (بیویاں) صرف اپنی خواہشات کا خاتمہ کرکے ہی حقیقت سے آشنا ہوسکتے ہیں۔

وقت، اساتذہ کا بھی استاد ہے۔ اگر سبق سیکھنا ہے تو ان ناسور جیسے سماجی مسائل کا خاتمہ کرنا ہوگا — لیکن شعور کی بیداری اور صاحبانِ فکر کی رہنمائی سے۔

ستي سيج هياس، مون کي آه اٿاريو
جنهن جوڳي جاڳاياس، آئون نہ جيئندي ان ري!

ترجمہ:

جب میں سکون کی نیند سو رہی تھی، تو کسی کی آہ نے مجھے جاگنے پر مجبور کیا،
جس نے مجھے جگایا، اب میں اُس کے بغیر جی نہیں سکتی!

علم اور جہل کا فرق

جب جاہل اپنی جہالت پر فخر کرتے ہوئے یہ کہے کہ "ہم عقلمندوں کو انگلیس سکھاتے ہیں"، اور عقلمند لوگ ادب و انکساری کے ساتھ حق کے حصول کی خاطر ہاتھ جوڑ کر، صف میں کھڑے ہوں، جبکہ معاشرہ تماشائی بن کر خود کو ہوشیار تصور کرے، تو یقیناً منزل قریب نہیں بلکہ اُس تباہی کی طرف جارہی ہے جہاں سب کچھ ختم ہونے کو ہوتا ہے۔ صرف امیدوں کی آمد و رفت باقی رہ جاتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ کامیابی کے مفہوم پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ہمت والوں کو چاہیے کہ صبر اور حوصلے کے ہتھیار تھامیں، مگر ان ہتھیاروں کا مقصد لڑائی نہیں، بلکہ امن کے دامن میں چھپی اصل صفائی، یعنی سچائی کو تلاش کرنا ہو۔ جہاں سے نقصان ہوا ہے، وہاں تحقیق (سرچنگ) کی جائے، تو چور اپنے ساتھیوں سمیت پکڑا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ آسان نہیں، مگر پھر بھی آنے والی نسل کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جانا چاہیے۔

یہاں "جاہل" سے مراد وہ شخص نہیں جو الف، ب، یا A, B, C نہ جانتا ہو، بلکہ جاہل وہ تعلیم یافتہ انسان ہے جو اپنے علم اور اختیارات کو ذاتی مفادات کی تجارت میں لگا دیتا ہے۔ وہ لوگ جو منشیات فروشی، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ اور دیگر ناقابل علاج سماجی بیماریوں میں مبتلا ہیں، جو وبا کی صورت اختیار کر چکی ہیں وہی اصل جاہل ہیں۔ ہم اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ رات کے اندھیرے میں دولت کمالی، مگر ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہماری اپنی اولاد بھی اسی موذی مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ہم دولت اکٹھا کرنے کے چکر میں اپنوں کو وقت دینے سے قاصر ہو جاتے ہیں، ہزاروں کلومیٹر دور جا کر کام کرتے ہیں، اور آخرکار ICU کے مہمان بن جاتے ہیں۔ عبادات اور مقدس مقامات تک بھی ایک فیشن اور روٹین کی طرح سفر اختیار کیے جاتے ہیں، لیکن جہاں دل کو سکون ملنا چاہیے، وہاں بھی کاروبار کی فکر، راحت کو چھین لیتی ہے۔

وقت، دولت اور زندگی— تینوں ضائع ہو جاتے ہیں۔ زندگی مختصر ہے، اور معلوم نہیں کب ساتھ چھوڑ دے۔ جو دولت ناجائز ذرائع سے کمائی جاتی ہے، جو دوسروں کا خون چوس کر جمع کی جاتی ہے، وہی دولت آپ کی اولاد کو بھی خون چوسنے والا بنا دیتی ہے۔ پھر وہی اولاد، جو ناجائز طریقے سے پالی گئی، آپ کی قبروں پر نحوست کی علامت بن کر بیٹھ جاتی ہے، اور یہ سب ایک عبرت ناک کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ذرا رک کر سوچ اے انسان! لطیف سائیں کی للکار کچھ یوں ہے:

پلي ڪيئي پلا، پرين اي نہ شان سندوء
پھرين لائي پرينٿو ڪين پڇين ٿو پوءِ
قادر شال ڪندوءِ، ميڙو مون مسڪين سين۔

(ترجمہ: اچھا کیا میرے محبوب لیکن یہ آپ کے شان برابر نہیں تھا۔ پہلے دل لے لیا پھر اب پوچھتے بھی نہیں ہو۔ اللہ پاک ضرور ہمیں ایک دن ملائینگے۔)

ایسے ہی دنیادار، خود غرض، فیشن زدہ اور روحانیت کے کاروباری لوگ، اپنا سکون برباد کرنے کے بعد، تمہارے لیے صرف عبرت کے نشانات چھوڑ گئے ہیں۔ اگر تم واقعی سکون چاہتے ہو تو مختصر مگر حلال کمائی پر قناعت کرنا سیکھو۔ تب ہی تمہیں مٹی کے بستر پر بھی سکون نصیب ہوگا، گھر کے بستر پر بھی۔ ورنہ کانٹوں سے سجا بستر خود تمہیں زخمی کرے گا۔ اے انسان! سوچ، غور کر، اور وہ راستہ اختیار کر جو کرم، سچائی اور حلال کمائی کا راستہ ہو۔

سچائی کی پہچان

زہر تو زہر اس کے قریب جانے سے تو، زہر ہی پھیلے گا؛ جو اس کے قریب جائے گا وہ بھی زہریلا ہو جائے گا۔ وہ زہر علمی ہو، فکری ہو، قلمی ہو یا سماجی جو بھی اس کے پاس ہوگا، اسی سے ہی مہمان نوازی (hospitality) کرے گا۔ میٹھا انسان ہر وقت میٹھی باتیں کرتا رہے گا؛ الفاظ ہوں یا حالات و سوچیں، فتنے پرست بیٹھے بیٹھے شہر کو آگ لگا دے گا، ہر وقت زہر و زخم بانٹے گا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے ذہنوں میں بھی فتنہ و فساد پیدا کرے گا۔ یہی ہمارے آج کے مکالمات اور دوستوں کی حالت ہے؛ چائے کے کپ پر، خراب بندوق میں ٹارچ نما موبائل ڈال کر، ایسے تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی جدید تجربہ کر رہا ہے، حالانکہ حقیقت میں جدید دور کے جھوٹ اور دھوکے ہمارے دوستوں میں بہت آشکار ہیں۔ چاہے ہوٹل کا کھانا ہو یا بڑے منصوبوں والی کرسیاں، ہمارے پاس برآمد (export) کرنے کے لیے ایسی دیگر مصنوعات بچی نہیں کہ فخر ہو؛ اگر کوئی چالاک ملاوٹ، چاپلوسی یا دھوکہ دے، تو ہم اسے پورا کر کے بھجوانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں، اور یہ نئی دریافت استعمال کروا دیتے ہیں۔ مڈل ایسٹ میں مسلسل بارود کی بدبو پوری دنیا میں محسوس کی جا رہی ہے؛ اس کی تند بدبو انسان کو للکارتی ہے، مگر کرونا کے بعد ماسک کے استعمال سے بڑے بڑوں کے نزلے زکام کا اثر ڈھکا پڑا ہے؛ اگر بمشکل کوئی مکھی یا مچھر ناک میں گھس کر ڈنک مار دے تو کوئی ماسک اتار کر اس بو کو سونگھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ پھر

بھی شعور والے انسان نے کوشش کی اور کر رہے ہیں، مگر آدم خور، انسانیت کا خون پی کر خوش ہیں؛ وہ خون چکھنے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے دوست کے سود خور اور ذخیرہ اندوز سستے مال خرید کر منافع کمانے کے چکر میں دن رات محنت کرتے ہیں، اور آبادگاروں کے جسم سے ایک قطرۂ خون بھی نہ چھوڑتے۔ شاہ صاحب نے بخوبی کہا ہے:

انڌيءِ وچون، ڪنڌيءِ وچون، تنگنيان لهي نہ تڪ،

صورت جا ساهڙ جي، ڏيل منهنجي ڏک،

واهڙ تنين وک، جن سانپارا سپرين۔

(ترجمہ: ہر طرف بچھو ہی بچھو ہیں اور میری تکلیف کم ہی نہیں ہو رہی ہے۔ میرے ساہڑ (محبوب) کی تصویر میرے اندر ہی ہے۔ دریاہ بھی ان کے لیئے ایک قدم اٹھانے جیسا ہے۔ جن کے دل میں محبوب کی یاد بسی ہے)

سوچو اے انسان، اپنے اندر کے زہر کو پہچانو، فتنے سے بچو، سچائی، ایمانداری اور حلال کمائی کو اپناؤ؛ یہی واحد راستہ ہے جس سے فرد اور قوم دونوں کو سکون و نجات نصیب ہو سکتی ہے۔

سچ اور جھوٹ کی پہچان

آج کے انسان اور کل کے انسان میں فرق بس اتنا ہے کہ کل کا انسان، انسان سے براہِ راست، بھالے یا تلواروں سے لڑتا تھا جبکہ آج کا انسان جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہو کر جدید آلات کی مدد سے انسانیت کو لٹکا رہا ہے۔ کل کے دور کے لوگوں کے پاس لوہے اور فولاد کے ہتھیار ہوتے تھے اور جسمانی طاقت بھی ہوتی تھی، جبکہ آج کا انسان سائنس و منافقت کے وسیع میدان میں ضربیں کھاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماضی میں منافقت نہ تھی، مگر وقت کے ساتھ انسان ترقی یافتہ ہوا ہے اور منافقت کے مظاہرے بھی بدل گئے ہیں۔ آج جب کہیں غبارہ پھٹتا ہے تو پوری دنیا سنتی ہے، مگر کان اور آنکھ رکھنے والے بھی اکثر خاموش رہ جاتے ہیں؛ انسانیت کی نسل کشی کے وقت اس فکری خاموشی کا سبب یہ ہے کہ نقصان پہنچانے والا زیادہ طاقتور اور ظالم ہوتا ہے اور کمزور انسان کچلا جارہا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آرام سے کنارے پر کھڑے ہیں ان پر رحم نہیں آتا، اور اگر کمزور کسی طاقتور کو آنکھ دکھا دیں تو وہی افراد طاقتور کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں؛ اس طرح کمزور کو مزید کچلا جاتا ہے۔ اگر طاقتور میں سے کوئی ضائع ہو جائے تو ماتم برپا ہو جاتا ہے، لیکن جب کمزوروں کی نسل ختم ہو جاتی ہے تو کسی کو فرق نہیں پڑتا؛ پھر بھی ہر طرف انسانی حقوق اور انسانیت کی باتیں کی جاتی ہیں، وہ بھی اسی دور میں جب سوشل میڈیا نے سچ اور جھوٹ کو یکساں منظر عام پر رکھا ہے۔ قانون اور قواعد بھی ہیں ممالک کے، مذہبوں کے، اقوام کے مگر اگر کسی معاملے میں مذہبی یا نسلی رنگ ڈالا جائے تو قصوروار کہلایا جاتا ہے؛ بہتر یہی ہے کہ انسان کو بطور انسان قانون کے تحت قدر دی جائے، تب بھی کوئی

احتجاجی آہنگ نکلے تو افسوس ہے۔ ہر طرف ہوشِ آوری کی باتیں کرنے والے، روشنی کے شوقین لوگ بڑی بڑی دوربینیں اور کمروں سے لیس بیٹھے ہوئے ہیں، مگر آنکھوں میں حقیقت کی بنائی ہوئی محرومی ہے؛ اگر کسی گاؤں میں رہنے والا شخص اندھا ہو تو یہ بات سمجھ آ سکتی ہے، مگر جب ساری دنیا اپنی آنکھیں مفادات کے لیے کھولتی اور بند کرتی ہے تو صورتِ حال کا اندازہ لگانا آسان ہوتا ہے۔ لوگ دعوت دیتے، قریب بٹھاتے، مگر اندر ہی اندر سانپ پالے رکھتے ہیں جو کسی وقت ڈنگ مار دیتا ہے؛ پھر دوست بن کر تسلی دیتے اور بعد ازاں دھوکے کی دکان کھول دیتے ہیں، یوں "دوست" کا لفظ بھی شرمندہ ہو جاتا ہے اور داغ ایسے چھوڑے جاتے ہیں جو تاریخ میں رقم ہو جاتے ہیں۔ بقولِ شاہ صاحب:

تون ڪوٺيين، تون ٻوهيين،ڏيئين تون ڏهاڳ،
دوست! تنهنجو داسڙا! دل اندر مون داڳ،
پانئيان سپ سهاڳ، جي مون وروهاريئين-

تم ہی دوست، تم ہی دشمن ہو۔ تم ہی زخم دینے والے اور مرہم دینے والے ہو۔ تمہارا ہی میرے دل کے اندر داغ ہے تمام درد و مصائب میرے لیئے خوشی کا سبب بن جائینگے اگر تم مجھے اپنا بنالو۔

فنا اور بقا کا شعور

منزلیں طے کرنے والے، اگر منزل کی مسافت اور راہ کی رکاوٹوں کو ضرور دیکھیں گے، اور کمزور ہو کر بیٹھ جائیں گے، تو شوق والے راستے کی ہیبت اور مشکلات دیکھ کر ان کے ارادے بدل جائیں گے۔

لیکن ایک پختہ ارادہ رکھنے والا انسان، جو یہ طے کر چکا ہو کہ مجھے تکالیف سہنی ہیں، محنت کرنی ہے، یہ ندی پار کرنی ہے تو وہ جستجو میں لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے ارد گرد سے ایسے اسباب، ایسے ذرائع تلاش کرے گا، جو اُسے ندی کے اُس پار پہنچا دیں۔

دیکھیں، سائنس دانوں نے ہواؤں میں اُڑنے والے جہاز بنائے، کئی ایجادات کیں جو انسان کے شعور میں صدیوں پہلے صرف خواب ہوا کرتی تھیں۔ زمین پر جانوروں کی سواری کی جگہ پر لوہے اور پلاسٹک کی سواریاں آئیں۔ حکمت، جو کبھی محض تجرباتی علم تھا، سرجری میں ڈھل گئی اور علاج یکدم ممکن ہوا۔ نیزہ، بھالا اور تلوار کی جگہ ایسے ہتھیار آئے، جن میں جسمانی قوت نہیں بلکہ ذہنی قابلیت زیادہ ضروری ہو گئی۔

قلم، سیاہی اور کاغذ کی جگہ لوہے کے قلم، ٹائپ رائٹر، کمپیوٹر اور سمارٹ فون آئے۔ پیغام رسانی، جو کبھی خط و خطابت تک محدود تھی، جدید سوشل میڈیا میں بدل گئی، اور دنیا کو ایک "گلوبل ویلیج" میں بدل دیا گیا۔ اسی طرح، بڑوں سے لے کر بچوں تک، ظاہری درسگاہیں اب ایک سمارٹ فون میں سِمٹ گئیں۔ کتب کا مطالعہ آسان بنانے کے لیے پی ڈی ایف، آڈیو بُکس اور بصارت سے محروم افراد کے لیے خصوصی ذرائع سامنے آئے۔ گھر کا کھانا بنانے سے نجات کے لیے، ہوٹلنگ، پیکڈ فوڈ، اور پارسل سروسز عام ہو گئیں۔

آدم کی پیدائش سے لے کر خوراک کی پیداوار بڑھانے تک، ہائبرڈ اجناس ایجاد ہوئیں۔ زمین کے ذخائر سے سمندر کے پانی تک، ہر شے سے استفادہ کیا گیا۔ اور انسان، ایک دوسرے پر حاوی ہونے کے لیے ہتھیاروں کی دوڑ میں بھی آگے بڑھا۔

یہ تمام ریفرنسز یہ تمام ایجادات دراصل انسان کی جستجو کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے زندگی کو ضائع کیا، کسی نے اسی زندگی کو خود اور دوسروں کے لیے بہتر بنانے میں صرف کیا۔

یہاں آ کر، عظیم انسانوں نے غور و فکر کے بعد انسانی ساخت، اس کی زندگی کے ایور تیج، اور انجام پر سوچنا شروع کیا۔ مختلف مذاہب، تہذیبوں، اور علوم سے، خاص طور پر قرآنِ پاک اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، جب انسان نے اپنا آپ پرکھا تو اُسے ایک اور زندگی کی حقیقت کا علم ہوا۔

ایک ایسی زندگی، جو دائمی ہے جس میں سکون ہے، قرار ہے، اور فنا کے بعد بقا ہے۔

اور جب تمام ظاہری علاج، سائنس، ایجادات، انسان کو بچا نہ سکیں تو یہ احساس اور مضبوط ہوتا گیا کہ اگر یہ زندگی فنا ہے، تو پھر بقا کس چیز کی ہے؟

یہی سوال جب فکر و تدبر رکھنے والے انسان نے اپنی زندگی کے مقصد کے طور پر اپنایا، تو اس نے ایسے رازوں کو پا لیا جو صرف ظاہری آنکھ سے نہیں، بلکہ قلب و شعور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ اس ادراک سے سرور پاتے، لطف اندوز ہوتے، اور باقی انسانوں کے لیے چراغِ راہ بنتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو ہم صوفیاء کرام کہتے ہیں۔ جیسے شاہ لطف اللہ فرماتے ہیں:

سدا پچ مر سھٽي! اونداھي اڌ رات،

پريان ڏي پرڀات، وانء ڏينھاري ڏينھن کي۔

اے سوہنی! ہمیشہ محبوب کی طرف آدھی رات کر کے مت جاؤ کبھی کبھی سحر دن کی روشنی میں بھی جایا کرو۔

یہ سب ہمت، پرکھ، اور جستجو کی کہانی ہے۔ کسی نے کسی کو سمجھا، کسی نے کسی کو جانا، کسی نے کسی کو دیکھا۔ لیکن اگر حقیقت واقعی کوئی ہے تو وہ ہے: فنا اور بقا کا شعور۔

عبادت اور دکھاوا

جس معاشرے اور سماج میں عبادات پر زور رکھا جاتا ہے، وہاں دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں: ایک تو معاشرے کے مقامات پر اچھا دکھائی دینا، اور دوسری روایت کے طور پر ایک دوسرے کے سامنے دکھاوے کا بڑا کردار۔

ایک طرف مقدس مہینوں میں لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں، اور اچھے سلوک کی امید پر واپسی پر صرف مبارکبادیں ملتی ہیں مگر اصل عبادت کا مغز اور نچوڑ بہت کم ہی محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ خالق اور مقررِ کائنات اور رسولِ اللہ ﷺ نے کچھ قواعد و قوانین بتائے ہیں، ہم ان کے قریب جانے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی انہیں راضی کرنے کی سچی جستجو دکھاتے؛ ہمارا شوق دنیا والوں کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے۔

افطار پارٹیاں بھی انہی لوگوں کے لیے رکھی جاتی ہیں جو روزہ رکھنے کی زحمت ہی برداشت نہیں کرتے۔ اور وہ طعام جن کے سامنے رکھے جاتے ہیں، وہ لوگ معاشی یا سماجی جکڑ کی وجہ سے اس میں پھنسے ہوتے ہیں؛ کھانے کی بات تو دور ہے قریب جانے سے ہی موت یاد آ جاتی ہے۔ اگر موت کو حق سمجھ لیا جائے ورنہ پھر ناجائز اکٹھا کی گئی دولت اور اشیاء کس کے لیے؟ آخر کار ملک الموت تک کالا سانپ بن کر بیٹھا رہتا ہے؛ رات کے وقت ساری کمائی کو یاد کر کے کئی بار بے چین ہو کر سونا پڑتا ہے۔

ایک طرف افطار پارٹیوں کی خوشبو روزہ داروں کے سامنے ہوتی ہے، اور دوسری طرف اللہ کے خوف سے روزہ رکھنے والے لوگ سارے بازار گھوم کر خالی ہاتھ، مٹی کے مٹکے والا پانی اور سوکھی روٹی اپنے بچوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ مسجد کے مؤذن کی اذان کے انتظار میں ہوتے ہیں، جب گاؤں کے مختلف گھروں سے بڑا سا ٹوکرا یا پھلِ نذر ان کے کھانے کے لیے پہنچتا ہے اور اس پر بار بار نظر جمائے رکھنا بھی ثواب شمار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ تو جہاں ہے، ربِ العزت اپنی مخلوق کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بات پھر ہمارے اعمال کے سامنے آتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ مہنگے علاقوں میں پلاٹ خریدتے ہیں، ان کا پورا ارادہ یوں ہی جنت پر قبضہ کرنے جیسا ہوتا ہے اگر ان کا بس چلے تو وہاں بھی بانٹ کر رکھ دیں گے۔ مگر ربِّ کائنات کی ترازو کی داد صرف حق کو ملتی ہے؛ یہ نظر آتا ہے مگر اندھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

کتنے بدمست تھے جوانی کے نشے میں، کتنے دنیا کی کارگزاری کے نشے میں مست تھے — جب خدا کی پکڑ نے انہیں گھیر لیا تو شکلیں پہچان سے بھی رہ گئیں؛ کوئی قریب آنے کی ہمت نہ رہی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

بک وڏائون بگريين جوڳي ڪندا جيج
طلب رکن مر طعام جي اوتيو پيين اج
لاهوتي لطيف چئي من ماري ڪيو ميج
سامي جهاڳي سيج وسنئن ڪي ويجها ٿيا۔

اللہ کے حقیقی بندے بھوک اور پیاس کو اچھا سمجھتے ہیں ان کو دنیاوی عیش عشرت کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اس دنیا نے ایسے بھی منجھے ہوئے مرد دیکھے ہیں آج بھی ان کا لنگر اسی طور پے چل رہا ہے، جہاں ہر کوئی پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ مگر انہوں نے خود کبھی ناجائز چیزوں کی طلب نہیں کی۔ وہ خوشامدی اور دکھاوا خاموشی سے ختم ہو جائے گا — جیسے آپ کے بزرگوں کے دور میں ہوا۔ پھر انسان دوبارہ سادگی پر لوٹ آئے گا، چارپائی پر بیٹھ کر روشِ سادگی اختیار کرے گا۔ ایسے راستے کی جانب جہاں اندھیرا اور تنہائی بھی ہو سکتی ہے، مگر سچائی اور عمل کی روشنی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

سچ اور جھوٹ

شہرت اور چمک دمک والے، چاہے اپنے بغض، حسد اور اندر کے جلے ہوئے جسم پر کتنی ہی قیمتی خوشبو لگالیں مگر جب قریب جائیں گے تو ان سے وہی مختلف عناصر کی بدبو محسوس ہوگی، جو اندر کی سچائی کو بے نقاب کرتی ہے۔آج کل ہر چیز ایک مصنوعی پروگرام بن چکی ہے وقتی ضرورت، وقتی شہرت، مگر اصل خلوص ندارد۔

جب تک دلوں میں دھوکہ، دغا اور خود غرضی کے بھانڈے بھرے ہوں، وہاں اپنائیت کی بات کرنا محض رسمی رسم و رواج بن کر رہ جاتا ہے — جس میں کوئی روح نہیں ہوتی۔اسی طرح، جب سماج میں ثواب کی نیت کے بغیر، محض نمائش کے لیے روزہ داروں کی افطار پارٹیاں سجائی جاتی ہیں، اور اس میں امیر و غریب کے لیے الگ الگ انتظام کیے جاتے ہیں — تو پھر ہماری دعائیں بھی ویسی ہی ہوں گی، جیسی ہماری نیتیں ہوتی ہیں۔

ایک طرف، ساٹھ قسم کے کھانوں کے ساتھ سجے دستر خوان پر، معززین بغیر روزے کے، صرف دکھاوے کے طور پر ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کے چہرے حسد اور شرم سے جلے ہوتے ہیں، ملنے کے بجائے میلوں کے فاصلے پر بیٹھے، ذائقے کے مزے کے پیچھے، ایک طرف بیماریوں کا خوف، اور دوسری طرف بھرے ہوئے پیٹ کی بے چینی۔

جبکہ دوسری طرف، وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی دعاؤں، ختموں اور خالی تھالوں سے بھوک مٹائی ہوتی ہے ان سے بھی ملامت، ان کی دعائیں صرف پھونک کی حد تک، اور ادھر برتنوں کی آوازیں گویا دھماکے کر رہی ہوتی ہیں۔

پھر بھلا کیا اللہ بھی ایسی خوشامدی رسم و رواج سے بے خبر ہے؟ فوٹو سیشن اور سوشل میڈیا کی پوسٹس زیادہ اہم ہو چکی ہیں واہ واہ کے تحفے بٹنے لگتے ہیں، گویا فلسطین فتح کر لیا ہو۔مگر حقیقت یہ ہے اگر قبر کی مٹی ذرا سی کھسک جائے، تو بدبو چھپائے نہ چھپے، بس وہی مٹی، ماں کی طرح آپ پر پردہ ڈال کر آپ کی لاج رکھے ہوئے ہے۔

آج اگر دن کے گول چکر (سورج) کو دیکھنا چاہیں تو جدید سوشل میڈیا آپ کے ہاتھ میں ہے مگر دیکھنے کی آنکھ کہاں ہے؟

اس ساری کائنات کا ایک ہی مالک ہے، اگر آپ کسی بھی دین یا دھرم سے تعلق رکھتے ہیں، تو بس انسانیت کا پیغام ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔

مگر افسوس کہ ہر مذہب کے پرچارک اپنے مفاد کے پجاری بن چکے ہیں۔اسلام کے قائدے اور قانون اپنی مثال آپ ہیں، چاہے ہم انہیں جتنا مرضی تقسیم کرنے کی کوشش کریں، مگر حکمِ ربی اور محسنِ انسانیت خاتم النبیین ﷺ کے احکامات کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ہم مایوس نہیں، لیکن افسردہ ضرور ہیں۔جب شاہ صاحب کو پڑھتے ہیں:

اڄ نہ اوطاقن ۾، سنڌي بابن باس،
ويا ويراڳي نڪري، ولها ڪري واس،
جن جي اندر ۾ اداس، سي لاهوتي لڏي ويا۔

(آج نہ اوطاقوں میں سچے بندو کی خوشبو ہے،
وہ راہی، جو سچ کی طلب میں نکلے تھے، آبادیوں کو چھوڑ کر چلے گئے،
جن کے دل میں سچ کی خوشبو تھی
وہی لاہوتی، وہی اہلِ دل، رخصت ہو چکے۔)

ہم نہ دیکھنا چاہتے ہیں، نہ تسلیم کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی آج ایسے مانجھی مرد ہمیں نظر آتے ہیں۔مگر پھر بھی، اگر سب گدھ اکٹھے ہو کر بھی کھائیں، تب بھی کہیں نہ کہیں خوشبو کی ایک مہک باقی رہتی ہے۔

خوش نصیبی

خوش نصیبی اور بد نصیبی دونوں ہی زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں، اور دونوں ہی کسی نہ کسی انداز میں زندگی کا سنگھار بن جاتے ہیں۔ جہاں بد نصیبی کی ندیاں زیادہ بہتی ہوں، وہاں لامحالہ دین بھی بٹتا ہے اور تقسیم و نفرت کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ پھر وہی معاشرہ ایک دوسرے کے "بال نوچنے" پر آ جاتا ہے، اور انجام کار نیست و نابود ہونے کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ایسے معاشرے میں کم ظرف، سست، کاہل انسانوں کی بھرمار ہوتی ہے، جو سستی اور بے عملی کے بستر پر ہوٹلوں پر قبضہ جمائے پڑے رہتے ہیں۔ آج جو پہلو طاقتور نظر آتا ہے، وہی کل کسی بزرگ یا عامل کے پاس جا کر "خوش نصیبی کے دھاگے" بندھوا رہا ہوتا ہے،
یا کسی مزار پر ویاج پر لیے گئے پیسوں سے مٹھائی چڑھاتا ہے کہ جیسے قرض میں جکڑا جانا ہی کامیابی کی علامت ہو۔ مگر یہ کیسی منطق ہے؟ کہ ویاج پر ویاج چڑھتا جائے، اور ہم اُسے خوش نصیبی سمجھ بیٹھیں؟

خوش نصیبی، محض نصیب سے نہیں، بلکہ وفا، خوبصورتی، قربانی اور جدوجہد سے جڑی ہوتی ہے۔ جیسے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہی خون کے بھائیوں کی بے وفائی کے باوجود حسنِ سلوک کو ترجیح دی، اور بد نصیبی کو صبر، اخلاص اور کردار سے خوش نصیبی میں بدل دیا۔ یا جیسے سرورِ دو عالم، خاتم النبیین ﷺ نے فتح مکہ کے وقت ان دشمنوں کو معاف کر کے، جنہوں نے آپ پر ظلم کیے تھے انہیں بد قسمتی سے نکال کر خوش نصیبی کے قافلے میں شامل کر دیا۔
یہی وہ اعلیٰ روایات ہیں، جنہوں نے تاریخ میں بد نصیبی کو بھی خوش نصیبی میں بدلنے کے باب رقم کیے۔

لیکن افسوس! آج کے معاشرے میں لوگ زبردستی خوش نصیبی کو چھوڑ کر، بد نصیبی کی طرف بھاگتے ہیں یا انہیں دھکیلا جا رہا ہے۔ ساری زندگی کے دھکے کھا کر، تمام مشکلات برداشت کر کے، آخرکار بد نصیبی کی چارپائی پر جا بیٹھتے ہیں، اور شام کو کسی خوش نصیب کے ساتھ چند لمحے گزار کر خود کو کامیاب سمجھنے لگتے ہیں۔

پھر دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں: "تم بھی ایسے ہی کرو!" حالانکہ وہ خود شام ہوتے ہی، بد نصیبی کی سستی، غفلت اور سگریٹ کی کشوں میں پھر سے گم ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے اندھیری رات نہ کوئی روشنی، نہ چاند کی کرن، نہ کوئی امید۔

مگر خوش نصیب وہ ہیں، جو اب بھی اس "محبوب حقیقی" کی تلاش میں سرگرداں ہیں جہاں فتح بھی ہے، راحت بھی، اور خوشبو بھی۔ بس فرق صرف اتنا ہے: جو در بدلتے ہیں، وہ بد نصیبی کی طرف جاتے ہیں اور جو پہچان رکھتے ہیں، وہی خوش نصیبی کے اصل وارث ہیں۔

جیسے شاہ لطیف فرماتے ہیں:

پلا پرين پر جهلا، وچينءَ ڪين ورچن،
ڏين برادون بکين کي، عيدون اگهاڙن،
تون ڪيئن سندو تن، ديوانا در مٿيين؟

ترجمہ:

میرے خوبصورت محبوب ہر وقت چمکتے چہرے کے ساتھ رہتے ہیں وہ بھوکے لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور ننگے لوگوں کو کپڑے پہناتے ہیں تو پھر تم کیوں ایسے لوگوں کا در چھوڑ کر جا رہے ہو۔

دن کے آخر میں، خوش نصیبی اور بد نصیبی دونوں کا تعلق تقدیر سے نہیں، کردار اور ارادے سے ہے۔ جو خوش نصیبی کو پہچان لیتا ہے، وہ رات کے اندھیرے میں بھی روشن چہرہ لے کر زندگی کے سفر پر نکلتا ہے اور جو پہچان نہیں پاتا، وہ سارا دن افطار کے دستر خوان پر بیٹھ کر بھی بد نصیبی کا بوجھ لے کر لوٹتا ہے۔

ایمان کا شوق

خوامخواہ یا ضرورتاً کسی سے چھیڑ چھاڑ، بعض اوقات دل میں ایسی گرہ ڈال دیتی ہے جو وقتاً فوقتاً چاہے بجائی نہ جائے خود بخود بج اٹھتی ہے۔ جیسے کہ کسی بڑے افسر کا، مردہ اور سوتا ہوا ضمیر اچانک بجلی کی کڑک اور طوفان کی گرج کے ساتھ جاگ جائے، اور برسنا بھی ایسا کہ سامنے والے کو سنبھلنے کا موقع تک نہ ملے۔ نہ سامان سمیٹنے کی مہلت، نہ تنبیہ بس اچانک ضمیر کی ایسی گونج، جیسے اندھیرے میں روشنی کا ایک زوردار کوندا، جو اندھوں کو بھی راہ دکھا دے۔

ایمان اور ضمیر کے سوداگروں کے لیئے اعلی نسل کے جانور، اب بغیر کسی شیلٹر کے کھلے میدان میں نظر آ رہے ہیں۔ طوفان کی خبر تو نہیں دی گئی، نہ کوئی پیشگی اطلاع لیکن خوشبو ضرور کسی ایک ایماندار، باضمیر انسان سے آ رہی تھی، جس نے شاید کسی "کوڈ ورڈ" میں اشارہ بھی دیا تھا، مگر افسوس، پیش گوئی کے ماہرین نے اسے نظر انداز کر دیا۔

ایسے بے وفا اور بے ایمانی کے موسم میں، اگر کبھی ایمان، اعتماد اور استقامت والی بارش برس جائے، تو وہ ایسے لگتی ہے جیسے سوکھے کھیتوں میں جان پڑ جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب کتنا اناج ایمان کے لیے جمع ہوتا ہے؟ کیونکہ اللہ کی طرف سے امید کبھی کم نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری طرف، مال کی ہوس میں پلنے والی ناسور زدہ نسل، نوجوانوں کی عزت، استادوں کا وقار، اور معاشرتی تربیت کو دھجیاں بنا کر نیلام کر رہی ہے۔

یہ معاشرہ، جو کبھی معیار کی بنیاد پر ترقی کرتا تھا، اب "رٹینگ"، "کمیٹی"، "پرچیاں"، "شناختی کارڈ" اور "چھاپے" کی بنیاد پر فیصلے کر رہا ہے۔ یا تو دیگ نہ چڑھائی جائے، اگر چڑھانی ہے تو ناپ تول تو درست ہو۔ ایسا نہ ہو کہ دو ٹن کے دیگ میں تین ٹن پانی ڈال کر ثواب سمجھ لیا جائے۔ آج حال یہ ہے کہ، اساتذہ، مقرر کردہ عملہ، ووٹنگ کی دھاندلی کو مر کر پورا کرنے والے، تاریخ کے چاند بنے بیٹھے ہیں۔ جیتنے والے اپنی جگہ مطمئن نہیں، ہارنے والے اپنے زخم

چاٹ رہے ہیں۔ سب اپنے افعال کی الجھنوں میں خوشیاں تلاش کر رہے ہیں۔ شاہ لطیف کیا خوب فرما گئے:

"پهرين ڪاري نانگ جي، ڪو چرڪيل چيڙ ڪري،
جي هٽي ڏنگ ڏسائيو ته ويجهو ڪين وري،
جيڪي ٽپ مري، جيڪي سڪي صحت کي-"

ترجمہ:

(اول تو کالے سانپ کو کبھی کوئی نہیں چھیڑتا،
اور پھر کسی کو وہ ڈس لے، تو دوبارہ قریب آنے کی ہمت نہیں ہوتی،
کیونکہ یا تو وہ مر جائیگا یا پھر ہمیشہ کے لیئے معذور ہو کر صحت کے لیئے تڑپتا رہیگا۔)

صورتحال بالکل سامنے ہے:

نہ کرسی سے چپکے رہنے کا کوئی شوق باقی رہا، نہ ہی دور کی پرہیزگاری کسی کام کی رہی، بخار بھی ایسا ہے کہ ہر ایک کا بدن چُور ہے، پسینہ بھی ایسا نچوڑا جا رہا ہے جیسے دل سے نکل رہا ہو

یہ معاشرہ اب انکار کے مقام پر آ پہنچا ہے نہ خود کو بدلنے کا ارادہ، نہ دوسروں کو معاف کرنے کی سکت۔

اطمینان اور جلد بازی

جدید دنیا کی سب سے بڑی خوبی ہو یا خامی، بے اطمینانی اور جلد بازی ہر طرف نظر آتی ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی منزل تک پہنچنے کی فکر میں گھسٹا چلا جا رہا ہے۔ چھوٹی شادیوں میں بڑے خواب، اور بڑے لوگوں میں چھوٹا بننے کی اداکاری روز ایک نیا تماشا رچا رہی ہے۔ غریب مزدوری کی فکر میں، مڈل کلاس فرسٹ کلاس میں داخلے کے خواب میں، اور افسران گریڈ بڑھانے کی دوڑ میں، ہر کوئی جیسے ناچنے پر مجبور ہے۔ صبح سے شام اور شام سے رات تک، سب اپنی اپنی راہ پر بھاگ رہے ہیں، کسی کو نہ منزل کی خبر ہے نہ تھکن کی پروا۔

کرسی کا بھی عجب کھیل ہے۔ جو اوپر بیٹھا ہے، وہ بھی رو رہا ہے، جو نیچے کچلا جا رہا ہے، وہ بھی آہ و زاری میں ہے، اور جو کنارے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے، وہ بھی آنسو چھپا نہیں پا رہا۔ دسترخوان پر چاہے سو نعمتیں رکھی ہوں، اگر نیت میں فتور ہو، یا وقت کی تنگی ہو، تو وہ بھی بدنصیبی کہلاتی ہے یا پرہیز؟ بھاگ دوڑ کرتے کرتے جب کسی سرکاری بس تک پہنچتے پہنچتے بس چھوٹ جائے، کرایہ بھی ادا کر دیا ہو، لیکن سوار نہ ہو پائے، تو وہ حسرت اور ہنسی میں لپٹی بے بسی کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ گھر والے ناشتہ کروا کر رخصت کرتے ہیں، راستے کا بھی خواب سجاتے ہیں، لیکن دوپہر ختم اور رات کا راستہ بھی بند ہو جائے، تو ایسی بدنصیبی کو کیا نام دیا جائے؟

یہی وہ جلد بازی ہے جو ہمارے رویوں میں، رشتوں میں، تجارت میں، حتیٰ کہ دوستی اور اقتدار کی رسہ کشی میں بھی رچ بس گئی ہے۔ ہم ہر کام میں فوری نتیجہ چاہتے ہیں، جیسے صبر اور تدبر کا کوئی مول ہی نہیں رہا۔ زندگی ٹک ٹاک کی رفتار پر چل رہی ہے، لمحے بھر میں فیصلہ،

لمحے بھر میں انجام۔ نہ انتظار، نہ غور و فکر۔ یہ دوڑ ایسی ہے کہ جو پہنچتا ہے، وہ بھی تھک کر گرتا ہے، اور جو رہ جاتا ہے، وہ بھی شرمندگی کے ساتھ اپنی قسمت کو کوستا ہے۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:

"پڄان جي نہ پڄان، وڃڻ سين وس ڪريان!

سگر مان! سڄان، تہ رائي ۾ رڙي مئي۔"

اگر میں محبوب تک پہنچ نہ بھی سکوں۔ لیکن منزل کی طرف بڑھنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ تاکہ محبوب کو پتہ چلے کہ وہ راستے کے مٹی میں ہی روتے ہوئے مر گئی۔

یہی حال آج کی اس بے حال دنیا کا ہے، جہاں نہ سوچنے کی فرصت ہے، نہ رکنے کی مہلت۔ سب بھاگ رہے ہیں، کچھ حاصل کرنے کے لیے، لیکن بہت کچھ کھو کر۔ یہ بھاگ دوڑ آخر کس کے لیے ہے؟ کون سا سنگھاسن، کون سا انعام؟ کامیابی کے دعوے دار، جب تھک کر گر جاتے ہیں، تو انہیں یہی سمجھ آتی ہے کہ شاید وہ ساری زندگی ایک غلط دروازے پر دستک دیتے رہے۔

یاد رکھیں، جلد بازی شیطان ہی نہیں، ناپختہ عقل کا مظہر بھی ہے۔ جو لوگ زندگی کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، وہ چاہے دیر سے پہنچیں، مگر ٹھیک مقام پر پہنچتے ہیں۔ اور جو بغیر سمجھے، صرف وقتی جذبات میں بہہ کر قدم اٹھاتے ہیں، وہ اکثر منزل سے پہلے ہی راہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس لیے اب بھی وقت ہے، رکیں، سوچیں، جانچیں اور پھر قدم بڑھائیں۔ کیونکہ ممکن ہے، جلد بازی میں اٹھایا گیا قدم صرف آپ کو نہیں، بلکہ آپ کے ساتھ جڑے بہت سے لوگوں کو بھی ایسی پٹڑی پر لے جائے، جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔ زندگی کو دکھاوے کا سفر نہ بنائیں، اسے ایک باشعور اور بامقصد سفر بنائیں۔

مصلحت و دور اندیشی

انسان تب ہی انسانیت سے خارج ہوتا ہے اور اس میں سے انسانی خوبیاں ختم ہوتی جاتی ہیں، جب وہ لالچ کو خود میں پالنا شروع کرتا ہے۔ وہ دولت کے شوق میں مبتلا ہوتے ہوتے بالآخر ایسا شوقین بن جاتا ہے کہ اپنے شوق کی خاطر سب رشتے کچل دیتا ہے۔ انسانیت کی طرف آنے والے راستے بھول جاتا ہے۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ مال اور جائیدادیں اکٹھی کرنے کے پیچھے، حق و ناحق سے بالاتر ہو کر ہر حد پار کرتا ہے، پھر شہرت اور شہوت کے پیچھے نکل جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ وہ دوسروں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے لگتا ہے اور آخرکار، بدنصیبی کی کرسی پر مست ہو کر رات دن اسی جستجو میں لگ جاتا ہے۔

اب وہ کرسی چاہے چھوٹی ہو یا اعلیٰ ایوانوں تک پہنچانے والی، ہمیشہ اس نے اپنے پاؤں سے ان سب کو کچل کر ختم کر دینے والی رسم ہی قائم کر رکھی ہے۔ کیونکہ اس ہوس اور حرس والی کرسی نے کسی دور میں، کسی سے بھی، کبھی وفا نہیں کی۔ وہ کرسی جس کے پیچھے لوگ پوری زندگی لگا دیتے ہیں، آخر میں ان کی اپنی ذات اور انسانیت کو ہی نگل لیتی ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کو نعمت خداوندی سمجھا۔ وہ لوگ جنہوں نے ہر حاصل کو عطیہ الٰہی جانا اور مخلوقِ خدا کی بھلائی کو اپنا مقصد بنایا۔ ان عظیم انسانوں کی زندگی کا ہر لمحہ علم، صحت، انصاف، روزگار اور راحت عامہ کے لیے وقف رہا۔ چاہے وہ چھوٹی چھوٹی کوششیں ہوں یا بڑے بڑے کارنامے، ان سب کا مرکز و محور صرف ایک تھا: انسانیت۔

ایسے ہی بے شمار صوفیائے کرام نے اپنے خانقاہوں میں لنگر سے لے کر دکھ سکھ میں ساتھ دینے تک، انسانوں کے لیے اصلاح کا دروازہ کھلا رکھا۔ بغیر کسی قیمت، بغیر کسی لالچ، ان کی باتوں میں کوئی ذاتی مفاد نہ ہوتا۔ وہ صرف اور صرف انسان کی بھلائی کے لیے جیتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت دونوں میں جزا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی یادیں

تازہ ہیں، ان کے مزاروں پر رش ہے، ان کے لنگر جاری ہیں، کیونکہ انہوں نے اللہ کی مخلوق کے لیے دل کھول دیا تھا۔

دیکھیں، اگر امام حسین علیہ السلام چاہتے تو مصلحت اور وقتی فائدے کی بنیاد پر سودے بازی کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اگر وہ بھی ویسا ہی کرتے، تو حق کی راہ دھندلا جاتی اور ہر کوئی فتح کی طرف بھاگتا۔ پھر کبھی بھی سچائی کا قافلہ نہ بنتا۔ یہی بات شاہ لطیف کے فلسفے میں بھی جھلکتی ہے، جب وہ کہتے ہیں:

پوڄا ڪارم پاڻ کي، جوڳي رکج جوڳ،
خلق خادم جئن ڪرين، اي راول وڏو روڳ،
پڳن ڪونهي پوڳ، نانگا وچن نڱيا۔

صرف "اللہ اللہ" کرنے سے اللہ نہیں ملتا، بلکہ اس کی مخلوق کو اپنانے، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے، ان کی بھلائی کے لیے جینے سے اللہ ملتا ہے۔ یہی طریقہ ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ آج بھی وہ لوگ جو اپنی ذات سے آگے نکل گئے، اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت میں لگایا، وہ قبروں میں ہونے کے باوجود زندہ ہیں۔ ان کا نام، ان کی فکر، ان کی خدمت سب صدقہ جاریہ بن چکی ہے۔

اور جو صرف اپنی ذات کے اندر محدود رہے، وہ اپنی زندگی کے ساتھ ہی فنا ہو گئے۔ وقت انہیں بھلا چکا، اور انسانیت انہیں معاف نہیں کرتی۔

رہبر، استاد، مرشد

دوستو! استاد اصل میں عشق ہی ہوتا ہے۔ یہ عشق علم سے ہو، عقل سے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت سے۔ اولاد یا والدین سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ انسان کو کسی بھی خوبصورت چیز کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ عشق کاروبار سے لے کر سیاسی امور تک محدود رہ جاتا ہے، لیکن استاد بہر حال عشق ہی ہونا چاہیے۔

اگر استاد ایک فکر اور فلسفہ بن جائے تو زندگی نکھر جاتی ہے۔ پھر زندگی میں کئی ہستیاں استاد کا روپ دھار کر داخل ہو جاتی ہیں، بس انہیں سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ ورنہ عقل اور فہم و فراست دور کی باتیں بن کر رہ جائیں گی اور کوئی نفع نہیں ہوگا۔

مشکل سے مشکل کتاب، چاہے وہ روحانی ہو، مذہبی یا تاریخی، وہ بھی دل لگا کر پڑھنے سے ایک استاد کی مانند بن جاتی ہے، بشرطیکہ انسان میں سیکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ حتیٰ کہ دنیا کے دکھ، سکھ اور رشتے داریاں بھی ایک بڑے استاد کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ایک سایے کی طرح رہتی ہیں اور حسد و جلن میں کبھی کمی بیشی نہیں ہونے دیتیں۔

اسی طرح مطلب پرست دوست اور منافق حضرات بھی بڑی الجھنیں مٹانے میں ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ بس آپ انہیں کوئی موقع دے کر دیکھیں، وہ فوراً استادی جتانے لگیں گے اور آپ کی ساری کمزوریاں لمحوں میں ادھر سے اُدھر پھیلا دیں گے۔

سید غلام حیدر شاہ قلندری کی

شایع شدہ کتاب	شایع ہونے والی کتاب
1. منهنجا سهڻا سڄڻ (ڪافيون)	1. وارداتِ عشق (تقريرون)
2. پلي چريو چون ماڻهو	2. باغِ وفا جون رمزون (روحاني ڪچهريون)
3. نرتؤن منجهان نينهن	3. لفظن جو جار (شاعري)
4. هو جي هليا هنگلور (نثر)	4. انعامِ عشق (سوالن جا جواب)
5. گونجيا گيت حيدر جا (شاعري)	5. بے سمجھی کی باتیں (اردو شاعری)
6. آثارِ قيامت	6. چوڏهينءَ وارو چنڊ (ڏاڏا سائين يوسف شاهه رح جي سوانح حيات)
7. آذانِ عشق (تقريرون)	7. جهونن جي جهوپڙي (اصلاحي ڪالم)
8. چنڊ چهرو محبوب جو (شاعري)	8. جوان جذبن ۽ پوڙهي وقت جي ڪڙي (اصلاحي ڪالم)
9. پرينءَ جي پار جون ڳالهيون.	9. خير خواهيءَ جي خيرات (ڪالم)
10. سڄڻ جن کي سڏيو	10. ڌٻي ۾ ٽڪريون (ڪالم)
11. اعلانِ عشق (تقريرون).	11. لڪيرن جا ليک (ڪالم)
12. انتقالِ عشق وصالِ يار (شاعري).	12. کلي ڪچهري (ڪالم)
13. نچوڙيو نينهن جن کي	13. لوازماتِ عشق
14. ہدایت نامہ سلوکِ قلندری	14. فلسفہ حسینیت
15. وفاءِ محمد ﷺ	15. جهنگل ۾ جهرمٽ
16. رڳون ٿيون رباب (الله پاڪ جو ذڪر ۽ ان جو نعمتون)	16. ڪچي ڪاچوٽي (ڪالم)
17. منيون پيڙي پچ (اصلاحي ڪالم)	17. وقت وارن جا ورق (ڪچهريون)
18. سفرِ عشق (ذکر اہل بیت اور زیارات مقدسہ)	18. لطيفي للڪار (ڪالم)
19. مقامِ محبت (عشقِ رسول ﷺ کے پروگرام، ربیع الاول 2021 کی محافل میلاد مصطفیٰ ﷺ)	
20. Salient Message of Sufism	
21. ٿهڪن ۾ ٽاڪوڙو (اصلاحي ڪالم)	
22. رازِ عشق	
23. The Vision of Life	
24. روميءَ جي اوطاق	
25. اسباقِ عشق	
26. ورتمر پر پٽائيءَ جي (ڪالم)	
27. سب چلتا ہے	
28. ميدان عشق (تقريرون)	
29. باغِ وفا جون رمزون	
30. خير خواهيءَ جي خيرات	
31. پيغامِ عشق	
32. منشور	
33. ہدایت نامہ سلوکِ قلندری۔ حصہ دوئم	